بدنامی

ایک بنگالی رومان

تسکین

پبلشرز کتابستان اردو۔لاہور

قیمت عہ
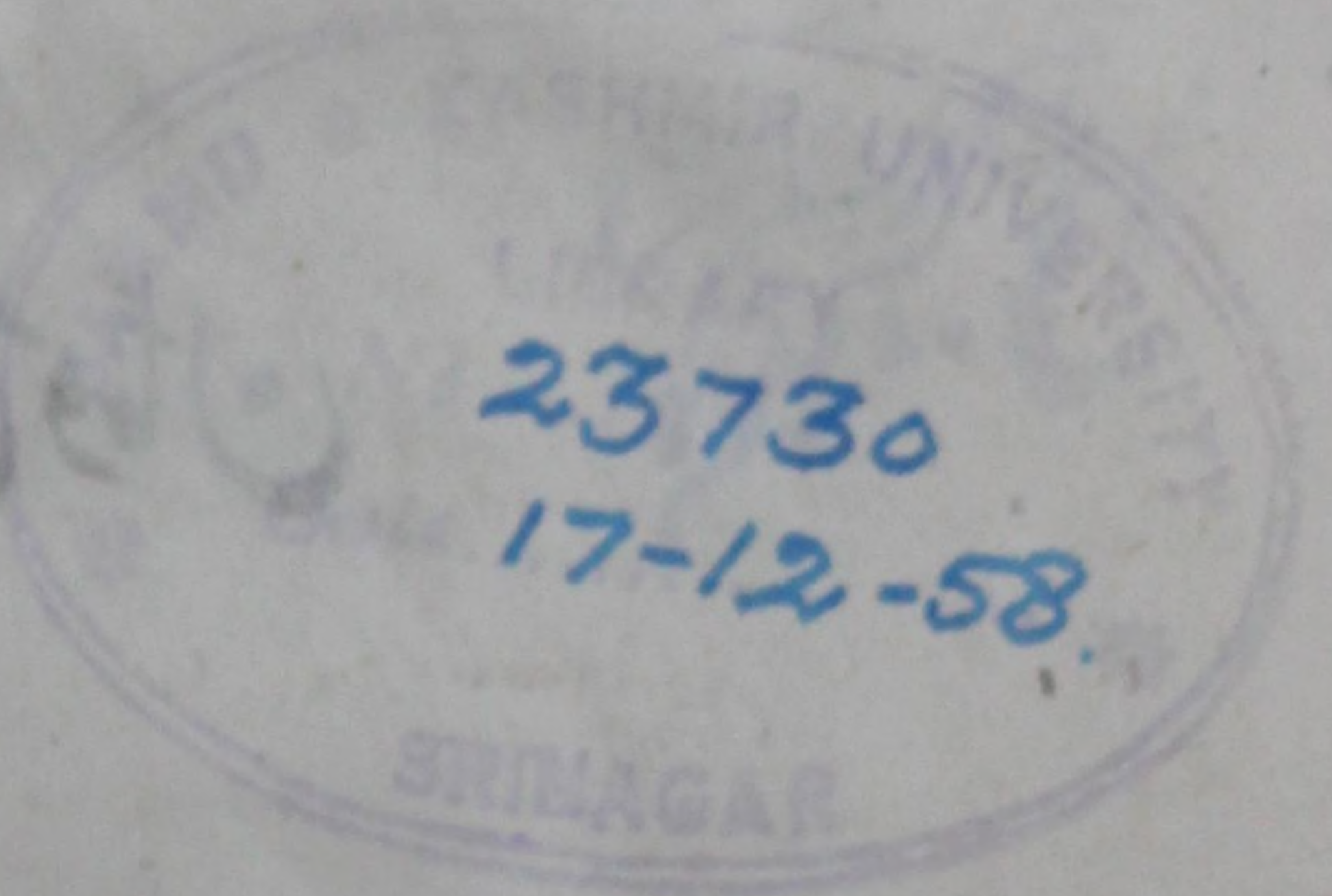
بدنامی

ملی تال کے نئے پوسٹ ماسٹر کے بارے میں لوگوں میں طرح طرح کی باتیں
مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ پنجاب کے کسی ڈاک خانہ میں تھے۔ اور اب اُن
کا تبادلہ اس جگہ ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ مدراس میں پوسٹ مین تھے۔
مگر اپنی لیاقت اور محنت کے سبب بہت ترقی کر گئے ہیں اور اسی طرح
سے لوگ کئی قسم کی باتیں اُن کے بارے میں کر رہے ہیں

مگر اصلیت کچھ اور ہی تھی۔ نئے پوسٹ ماسٹر ونود میں نہ تو "پنجابیت"
ی تھی۔ اور نہ "مدراسی پن"۔ بہت سیدھے سادے تھے۔ ونود بابو پرانے
وسٹ ماسٹر کے تبادلے کے متعلق کسی کو خیال تک نہ تھا اچانک ایک
ن ونود آ گئے۔ اور ان کو جانا پڑا۔ ونود بابو کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں کے
ہنے والے ہیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا

ونود بابو، کم گو اور سنجیدہ سے ہیں۔ عملہ پر ان کا رعب بھی کافی ہے
ب سے یہ آئے ہیں پوسٹ آفس میں ایک خاموشی سی چھائی
ہتی ہے۔ عملہ چپ چاپ اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔ اور

اب شاید کسی کو بات تک کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ ڈاک خانے کا کام بڑی اچھی طرح سے ہو رہا ہے۔

دنود اپنی بڑی میز پر جھکے کاغذ دیکھتے رہتے ہیں کبھی کبھی سر اٹھا کر چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہیں۔ پھر سر جھکا کر کام میں مشغول ہو جاتے ہیں

دنود سادگی کے ساتھ اپنے دن نبھا رہے ہیں۔ دفتر سے نکل کر سیدھے اپنے کوارٹر میں آجاتے ہیں۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلتے ہیں تب تک اُن کا پہاڑی ملازم وشنو چائے لے آتا ہے۔ چائے سے فارغ ہو کر اپنے "ٹائگر" کو ساتھ لے کر سیر کے لئے نکل جاتے ہیں پارک کو پار کرنے کے بعد مال روڈ سے ہوتے ہوئے جھیل کے کنارے آکر بیٹھ جاتے ہیں آفتاب کے غروب ہونے کے بعد وہاں سے اٹھتے ہیں ٹائگر کو ساتھ لے کر چھڑی گھماتے ہوئے اپنے کوارٹر میں واپس آجاتے ہیں۔ کپڑے تبدیل کرتے ہیں اور اس کے بعد وشنو اور اس کے پکائے ہوئے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے کھانا کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ جاتے ہیں اور جب تک نیند نہیں آتی لیٹے ہی لیٹے کوئی کتاب دیکھتے رہتے ہیں اور ٹائگر بھی چپ چاپ ٹکٹکی لگائے اُن کی طرف دیکھتا رہتا ہے

دنود شنکر حلیم الطبع اور خاموش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی میں کبھی ہلچل پیدا ہی نہیں ہوئی۔ شاید کبھی ہوئی ہو۔ مگر یہ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کیونکہ وہ تو خاموش ہیں

ہفتہ والے دن ڈاک خانہ جلدی بند ہو جاتا ہے اس لئے کام زیادہ
تھا اور ہر کھڑکی پر خاص بھیڑ تھی۔ کلرک بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنا اپنا
کام کر رہے تھے۔ اور ونود شنکر کبھی کبھی سر اٹھا کر یہ دیکھ لیتے تھے کہ کام ٹھیک
طور پر ہو رہا ہے یا نہیں؟

اچانک انہیں سیونگ بنک کی کھڑکی پر کچھ شور سا سنائی دیا۔ دو
عورتیں کلرک کے ساتھ بحث کر رہی تھیں۔ معمولی بات سمجھ کر ونود شنکر پھر
اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

"کیا پوسٹ ماسٹر صاحب آپ ہی ہیں؟"

"جی" کہہ کر جب ونود شنکر نے سر اٹھایا۔ تو دیکھا کہ ان کی میز کے
سامنے وہی دو عورتیں کھڑی ہیں ایک تو ان میں سے ادھیڑ عمر کی ہے جس
کے چہرے کی بناوٹ کہہ رہی ہے۔ کہ وقت نے اس کے کڑے امتحان لئے
ہیں۔ مگر اس نے بھی خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ دوسری ایک بیس برس
کی خوبصورت عورت ہے۔ ونود شنکر نے پاس ہی پڑی ہوئی کرسیوں کی
طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بیٹھئے!"

نوجوان عورت بولی۔ "ہم بیٹھنے نہیں آئی ہیں ہم آپ کے ڈاک خانے
کے کلرکوں کی بدتمیزی کی شکایت لے کر آپ کے پاس آئی ہیں۔ عورت
جوش میں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چند لمحوں تک تو ونود شنکر تعجب
کے ساتھ اس کے حسین چہرہ کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر نگاہیں نیچی کر کے
بولے۔ "آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں اطمینان سے کہئے۔ میں آپ کی شکایت

دُور کرنے کے لئے پُوری پُوری کوشش کروں گا۔ یاد رکھئے ہمارا محکمہ عوام کی خدمت کے لئے ہی تو بنا ہے۔"

مگر وہ نہ بیٹھی۔ دنود شنکر کی رسیلی زبان بھی اُس کے غصّہ کو دُور نہ کر سکی وہ کچھ کہنے ہی والی تھی۔ کہ ادھیڑ عُمر کی عورت بول اُٹھی۔ "بیٹھ جا لالی! شاید پوسٹ ماسٹر صاحب ہماری کچھ مدد کر سکیں"

لالی نے ایک مرتبہ اس ادھیڑ عمر والی عورت کی طرف دیکھا پھر پوسٹ ماسٹر صاحب کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کے بعد کرسی اپنی طرف کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"آپ بھی بیٹھئے ماں جی! ہاں اب کہئے" دنود شنکر بولے

لیکن کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد بھی لالی چُپ رہی۔ دنود شنکر تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد لالی کی طرف دیکھ کر بولے "کہئے کیا بات ہے؟"

ادھیڑ عُمر کی عورت نے کہا۔ "بتا دے سب کچھ لالی!"

لالی نے پھر ادھیڑ عُمر والی عورت کی طرف دیکھ کر اپنی جیب سے سیونگ فنڈ کی پاس بُک نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا: "یہ میری والد ہیں۔ میرا نام انجلی ہے۔ یہ مجھے لالی ہی پکارا کرتی ہیں۔ میں یہاں گرلز سکو میں اُستانی ہوں وہاں سے جو تنخواہ ملتی ہے اُسی سے ہم دو نو ماں بیٹی ک گذارہ ہوتا ہے"

دنود شنکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ لڑکی اپنے گھریلو حالات کیوں ان

سامنے رکھ رہی ہے۔ اپنی شکایت کیوں نہیں بیان کرتی اُن کو یہ تمہید بیکار سی معلوم ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ چپ چاپ سُن رہے تھے پاس بُک انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اور اس کے صفحات اُلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

لالی نے کہا۔ پتاجی کو مُرگباش ہوئے سات آٹھ برس ہو چکے ہیں۔ اُس وقت میں تیرہ چودہ برس کی تھی۔ اور سکول میں پڑھتی تھی۔ میرا اور کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس لئے پتاجی کی موت کے بعد اُن کا ڈاک خانہ میں جمع کیا ہوا روپیہ مجھے ملا۔ روپیہ ڈاک خانے ہی میں جمع رہا اور میرے دستخطوں کی نقل لے لی گئی۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد مجھے ملازمت مل گئی اور ہمارا گزارہ بڑی اچھی طرح سے ہونے لگا۔ مگر پھر بھی ہمیں کبھی مزید روپوں کی ضرورت پڑ جاتی اور ہم ڈاک خانے سے نکلوا لیتے" اتنا کہہ کر لالی نے روپے نکلوانے کا فارم دیونشنکر کی میز پر رکھ دیا۔ پھر بولی "جب تک یہاں پرانے پوسٹ ماسٹر صاحب رہے ہمیں روپے نکلوانے میں کسی قسم کی تکلیف نہیں۔ جب ضرورت پڑتی تھی۔ روپیہ نکلوا کر لے جاتی تھی آج بھی روپیہ نکلوانے آئی ہوں۔ مگر آپ کا کلرک کہتا ہے کہ روپیہ نہیں ملے گا۔ میں نے جب دریافت کیا "کیوں؟" تو کہنے لگا۔ دستخط ٹھیک نہیں ثابت ہوتے"

میں نے کہا۔ "کیا فرق ہے؟"

"اس نے کہا "میں نہیں بتا سکتا"

"میں آپ سے پوچھتی ہوں۔ کہ اتنا جھگڑا کس لئے ہو آپ ہی بتائیے کہ آپ کے اڈیکین کے دستخط سے آپ کے آج کل کے دستخط مشابہت رکھتے ہیں کیا؟ میں ڈاک خانے والوں سے دھوکہ کرنے نہیں آئی ہوں۔ جو وہ میرے فارم کو ردی کر دیا گیا ہے"

کچھ دیر پہلے بابو وںودشنکر نے اس فارم پر سُرخ نشان لگا دیا تھا۔ کیونکہ اس فارم پر کئے ہوئے دستخط اُن دستخطوں سے نہیں ملتے تھے جو ڈاک خانہ میں موجود تھے۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری کو بھلا اپنے اوپر کیوں لے لیتے۔ لالی کی بات سُن کر وہ بڑے حیران ہوئے کہ اس نے اتنی سی بات کو بتنگڑ کیوں بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہی قصہ اگر وہ مختصر الفاظ میں بیان کرتی تو بھی سمجھ میں آجاتا۔ بولے "آپ کی شکایت دیوی جی میں نے سُن لی ہے۔ اور آپ کی کہانی بھی۔ جو آپ کی رائے ہے وہی میری بلے ہے لیکن آپ جانتی ہیں ہمارے محکمہ کے قواعد و ضوابط بھی ہیں۔ یہاں ہر شخص کو چوکنا ہو کر کام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر کلرک اپنی غلطی کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے دانستہ طور پر وہ غلطی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ سیونگ بنک اکوئنٹس میں تو آدمی کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے ہم آدمی کی پہچان اس کے دستخطوں ہی سے کرتے ہیں اور تو کوئی پہچان ہمارے پاس نہیں ہوتی۔ آدمی کے دستخط ہی اس کی ضمانت ہوتے ہیں"

"میں یہ مانتی ہوں مگر آدمی کے دستخطوں میں ذرا فرق ہونے پر

اتنی بے اعتباری کیوں؟" لالی نے دریافت کیا۔

"تھوڑا سا فرق ہو تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دستخطوں میں تھوڑا بہت فرق پڑ ہی جایا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ فرق بہت بڑا فرق ہو تو پھر ہم مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"دیوی جی! میں مانتا ہوں کہ جب آپ نے ڈاک خانہ کو دستخط کر کے دیئے تھے۔ وہ زمانہ آپ کی طالب علمی کا تھا۔ آپ کی عقل بھی کچی تھی اور تعلیم بھی ادھوری تھی۔ اب آپ کی عقل پختہ ہو چکی ہے۔ اور تعلیم بھی اور اس لئے آپ کے دستخطوں میں بھی فرق آگیا ہے۔ مگر معاف کیجئے گا۔ آپ کے دستخطوں میں فرق نہیں ہے۔ وہ تو تبدیل ہو چکے ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں" لالی نے حیران ہو کر کہا

ونود شنکر تھوڑی دیر تک رسید پر کئے ہوئے دستخطوں کی طرف دیکھتے رہے۔ اس پر انگریزی حروف میں انجلی دیوی لکھا تھا۔ اور اس پر انہوں نے سرخ پنسل سے موٹا سا نشان لگا دیا تھا۔ بولے "ہمارے ہاں بتانے کا قاعدہ تو نہیں۔ مگر میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ جس دن آپ نے ڈاک خانے میں سیونگ بنک اکونٹ کھولا تھا۔ اس دن آپ نے ہندی میں دستخط دیئے تھے۔ اور اس وقت یہاں اس فارم پر آپ انگریزی میں دستخط کر رہی ہیں۔ اب تو آپ سب کچھ سمجھ گئی ہوں گی"

انجلی دیوی کو سب کچھ یاد آگیا۔ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی "واقعی میں

اس میں قصور میرا ہی ہے۔ مجھے اس بات کا رتی بھر بھی خیال نہیں رہا۔ ہر روز انگریزی میں دستخط کرتی ہوں۔ اس لئے آج یہاں بھی کر دیئے۔ آپ کا وقت ہرج کیا۔ اور ڈاک خانہ پر الزام دھرا۔ مجھے اس کے لئے افسوس ہے۔ مگر مجھے روپے کی بڑی ضرورت ہے۔ اب کیا کروں؟"

"آپ دوسری رسید پُر کر دیئے۔ اس کے علاوہ دستخطوں کی تبدیلی کے متعلق بھی ایک درخواست دے دیجئے۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اس سے آپ کو بھی تکلیف نہ اٹھانا پڑے گی اور ہمیں بھی آرام ہو جائے گا"

اس کے بعد ونود نے نئی رسید اپنے سامنے پُر کروائی۔ اور سیونگ بنک اکونٹ کلرک میاں ارشد کو بلا کر اس کو فارم بھی دے دیا۔ اور روپے بھی منگوا لئے۔

جب ارشد روپے لے آیا۔ تو لالی کو روپے دے کر انہوں نے کہا کہ "آئندہ اس بات کا خیال رکھئے گا"۔

لالی نے شرمندہ ہو کر کہا "آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ معاف کیجئے"۔

جواب میں ونود شنکر تھوڑا سا مسکرائے اور "نمستے" کا جواب دے کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

اتوار کو ڈاک خانے کا کام ختم کرنے کے بعد تانگہ کو ساتھ لے کر ونود شنکر مال روڈ پر آ گئے

نینی تال میں اتوار کو بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ کیا مرد کیا عورتیں سبھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار سیر کے لئے نکلتے ہیں چھوٹے چھوٹے بچے

اپنے اپنے ٹٹوؤں پر سوار ہو کر جھیل کے کنارے کی سیر کا لطف لیتے ہیں کچھ لوگ رکشا کی سیر سے ہی دل بہلا لیتے ہیں۔ مگر دنو دشنکا اس چہل پہل سے بچنا چاہتے تھے۔ اس لئے دناپو لوگراؤنڈ میں سے ہو کر درگا مندر کی طرف نکل آئے۔ سوچا چلو دیوی بھگوتی کو پرنام کرتے چلیں

ٹانگہ کو مندر کے باہر باندھ کر وہ اندر مندر کے صحن میں آ گئے۔ گرگابی اتار کر برآمدے میں سے ہوتے ہوئے دیوی بھگوتی کی مورتی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ مندر میں کافی بھیڑ تھی انہوں نے بھی ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیا کیا پرارتھنا کی؟ کیا مانگا؟ یہ معلوم نہیں

واپس آ کر گرگابی پہنی، پھر باہر آ کر ٹانگہ کی زنجیر کو کھولنے لگے۔

"نمستے"

سر اٹھایا۔ تو سامنے انجلی دیوی کھڑی تھی

"مجھے پہچانا آپ نے؟"

نمستے کا جواب دیکر دنو دشنکر بولے "آپ کو بھلا کبھی بھول بھی سکونگا" شاید کل والے واقعہ کو یاد کر کے وہ شرمندہ ہو گئی ہو۔ مگر پھر بھی پوچھا

"آپ کو کتنوں ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔ کیا سبھی کو یاد رکھتے ہیں؟"

"رکھتے تو نہیں۔ مگر رکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور اکثر کو یاد رکھا ہی جاتا ہے"

"یہ اکثر سے رعائت کیوں؟"

"یہ کڑیاں جڑ کر ہی تو سماج بنا ہے نا؟ میل ملاپ سے زندگی کا سفر

آرام سے کٹ جاتا ہے۔ کیا مندر جا رہی ہیں؟

"نہیں مندر سے ہو کر آ رہی ہوں۔ آپ تو دکھائی نہیں دیئے"

دنود نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ٹائیگر انجلی کو پریشان کر رہا تھا۔ دنود شنکر کے ہٹانے پر بھی نہ جاتا تھا۔ انجلی نے کہا "بڑا پیارا کتا ہے کیا نام ہے؟"

"ٹائیگر"

"نام بھی پیارا ہے۔ آپ کہاں جایئے گا؟"

"یونہی سیر کے لئے نکلا تھا مگر میں بھیڑ بھاڑ سے ذرا گھبراتا ہوں"

"چلئے پاشان دیوی کی طرف چلیں"

لیکن دنود شنکر کی سمجھ میں یہ بات نہ آ رہی تھی کہ یہ لڑکی کیوں اُن سے واقفیت پیدا کر رہی ہے کونسی خوبی ہے اُن میں؟ اور ان سے واقفیت حاصل کر کے اسے کیا حاصل ہو گا؟

یہ تو کسی کی طبیعت پر منحصر ہوتا ہے نا؟ کیونکہ نے ملنسار طبیعت پائی ہوتی ہے۔ ناواقف کو دیکھا جھٹ واقف بنا لیا۔ اور یہ لڑکی بھی ویسی ہی معلوم ہوتی ہے شاید واقفیت بڑھا کر اپنے علم میں اضافہ کرتی ہو۔ سکول کی استانی ٹھہری۔ مگر شرم والی بھی تو ہے؟ پھر؟

"آپ کی تعریف" سکوت کو توڑتے ہوئے انجلی نے دریافت کیا

"دنود شنکر ورما" کہہ کر انہوں نے پوچھا "آپ کب سے پڑھانے کا کام کرتی ہیں دیوی جی؟"

"تقریباً چار سال سے مَیں پڑھانے کا کام کر رہی ہوں"

"ایک بات دریافت کروں؟"

"کیجئے"

"دریافت کرنا مناسب تو نہیں پھر بھی پوچھتا ہوں۔ آپ نے پڑھانے کا کام کیوں شروع کیا؟"

ٹامگر بار بار دونو کے درمیان آجاتا تھا چنانچہ دتو دشنکر نے اس کی زنجیر اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی

انجلی جھیل کی لہروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا آنچل اڑا جا رہا تھا دونو ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"آپ نے جو سوال کیا ہے۔ اس کا مختصر جواب دینا تو مشکل ہے مگر پھر بھی دوں گی۔ اکثر مجھ سے ملنے والے یہی سوال کیا کرتے ہیں اور میں صرف "شوق" کہہ کر اُن کو ٹال دیا کرتی ہوں۔ مگر مَیں آپ کو ضرور بتاؤں گی آپ کو میرے "حوصلہ" پر تعجب ہوگا۔ کیونکہ آپ لوگ اکثر ہندوستانی عورت کو شرم وحیا کی پتلی ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں نا۔ مگر اب دُنیا بدل چکی ہے اور اگر اُن کے ساتھ ہندوستانی عورت بھی بدل جائے۔ تو ہرج ہی کیا ہے؟"

دتو سامنے کی پہاڑوں والی قطار کی طرف دیکھ رہے تھے جن پر سفید بادلوں کی گھٹائیں چھا رہی تھیں انجلی کی بات سن کر اُن کے دل میں بھی شاید طوفان سا اٹھ رہا تھا بولے "دُنیا کے ساتھ بدلنے میں کوئی ہرج نہیں ہے انجلی دیوی! دُنیا میں انقلاب ہوتا ہی رہتا ہے

اور نارنگی کا رادبھی تو انقلاب میں ہی مضمر ہے نا، انقلاب ہی آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے!"

"یہی خیال میرا ہے۔ لیکن کچھ دقیانوسی لیک کے فقیر اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ کیوں؟ آزادی کیا گناہ ہے؟"

"جی نہیں آزادی گناہ نہیں ہے۔ گناہ ہے غلامی، اور اس سے بڑھ کر گناہ دل کا کہا نہ ماننا ہے"

"لیکن دُنیا تو اسے پابند کرنا چاہتی ہے۔ دل کی بات دل میں رہنے دو۔ خیالات کا اظہار نہ کرو۔ خیالات کو دبا دو"

"یہ دُنیا کی بھول ہے۔ اور اس بھول کو سدھارنا ہمارا فرض ہے نئی پود کو یہ سکھا کر اس بھول کو بہت کچھ سدھارا جا سکتا ہے"

"جی میں ایسا ہی کرتی ہوں۔ میں دُنیا میں اندھیرا نہیں کرنا چاہتی بلکہ اس کو روشنی دینا چاہتی ہوں میں سماج اور دیش کی جتنی بھی خدمت کر سکوں گی کروں گی"

"آپ مبارک ہیں!"

سامنے سمر ہاؤس تھا۔ ونود شنکر بولے: "آپ کے ساتھ بات چیت کرنے کی مجھے بڑی خواہش ہے۔ آیئے کچھ دیر یہاں بیٹھیں"

انجلی نے اثبات میں سر کو ایک ہلکی سی جنبش دی کھمبے کے ساتھ ٹانگہ کو باندھ کر دونو بنچ پر جا بیٹھے۔ بوٹ کلب کے ممبر بوٹنگ کر رہے تھے۔ یہ نظارہ بڑا سہانا تھا۔ کشتیاں اس طرف نہ آسکتی تھیں

کیونکہ اس طرف پانی میں بڑے بڑے پتھر تھے۔ کئی لمحہ تک وہ دو نو کشتیوں کی دوڑ کو دیکھتے رہے

۲

جھیل کی دوسری طرف دکانوں میں اور سینماؤں کے سامنے اس قدر ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ گلوب سینما کے باہر ریکارڈ سننے والوں کا اس قدر ہجوم تھا۔ کہ رکشا والوں اور گھوڑ سواروں کے لئے راستہ ملنا مشکل ہو رہا تھا۔ اور ان فلمی گانوں کی آواز جھیل کی سطح کو چھوتی ہوئی ان تک بھی پہنچ رہی تھی۔ سفینہ کی آواز میں سوز تھا

مال روڈ پر رکشا گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ ان کی گھنٹیوں کی آواز نے بھی عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ راستے میں آنے جانے والے کتنے ہی فوجی سپاہیوں اور راہگیروں کو انہوں نے دیکھا۔ پولو گراؤنڈ کے بنگلے کے پاس گول سڑک پر درختوں کے نیچے، درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں، خشک پتے، اور ردی کاغذ، کچھ مزدور عورتیں جمع کر رہی تھیں فضا میں ان کے دلکش نغمے کی آواز گونج رہی تھی۔

دنیا میں کتنی چہل پہل ہے۔ مگر درحقیقت یہ خوش ہیں؟ شاید نہیں ہر شخص کو کچھ دکھ ضرور ہے۔ پھر وہ اپنے دکھ کو چھپا کر سکھ کا ناٹک کھیلتا ہی کیوں ہے؟ دکھ کیا اتنا برا ہے؟

کچھ دیر تک ونود شنکر اور انجلی دونوں ہی خاموش رہے۔ اس کے بعد انجلی نے کہا۔ ابھی تک میں نے آپ کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ آپ

خیال کرتے ہوں گے۔ کہ میں شاید اسے ٹالنا چاہتی ہوں۔ مگر میرا ایسا خیال نہیں ہے مجھے سوال کا جواب دینے کے لئے مناسب تمہید کی ضرورت تھی۔ آپ اکتا ئے تو نہ ہوں گے؟"

دنود شنکر انجلی ہی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کل یہ لڑکی ان سے پہلی بار ملی تھی۔ اور اس کے بعد یہ اتنی گھل مل گئی ہے۔ مگر کیوں؟ کیا وہ اس کے لئے اپنے فرض کچھ زیادہ آگے بڑھ گئے تھے۔ ایسی اچھی ہے یہ دنیا؟

کل ایک چھوٹی سی بات کو لے کر اس نے ایک بڑی لمبی چوڑی تمہید کی صورت میں اپنی ساری کہانی کہہ ڈالی تھی۔ اور آج پھر اچانک مندر کے سامنے ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اور کل انہوں نے جو اپنے فرض کی ادائیگی کی تھی اس کو یہ اتنا بڑا احسان کیوں مانتی ہے

آج وہ چند ہی لمحوں میں ان کے کچھ اس طرح نزدیک ہو گئی ہے۔ جیسے وہ جنم جنم سے ایک دوسرے کے نزدیک ہوں آج انہوں نے اُس کی بات چیت سے جان لیا ہے کہ یہ لڑکی آزاد خیال کی ہے اور اس کے ساتھ تعلقات بڑھانے سے کوئی ہرج نہ ہوگا

دنود شنکر کے گذشتہ حالات کوئی نہیں جانتا۔ تیس سال تک عورت ان کے لئے معمہ بنی رہی۔ وہ اس کے نزدیک نہیں جا سکے۔ اور اب۔۔۔

۔۔۔ اب کیا وہ اس کے نزدیک جا سکیں گے۔ کہا نہیں جا سکتا۔ "جی بالکل نہیں اکتایا آپ کہئے؟"

"آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کیسا انوکھا سوال ہے! انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میری طرف تھی۔ چنانچہ وہ پڑھ نہ سکے۔ بولے "اس سوال کے جواب میں اس وقت نہیں دے سکتا۔ پھر کبھی موقع ملا تو دوں گا"

"کبھی سہی! ہندو سماج کی حالت آپ جانتے ہیں اس میں عورت کا کیا درجہ ہے۔ یہ بھی آپ جانتے ہی ہیں۔ وہ پرانی کہانی میں یہاں دہرانا نہیں چاہتی۔ میں یہاں صرف وہی کچھ کہوں گی جو مجھے کہنا ناگزیر ہے۔ آپ کے سوال کا جواب میں ایک لفظ ہی میں دے سکتی ہوں اور ہندو سماج عورت کے درجے کو مدنظر رکھ کر آپ اہمیت کو جان بھی جائیں گے"

"یقیناً! آپ تفصیل میں جا کر جو کچھ کہنا ہو اختصار میں کہیئے"

"میں شروع میں حالات سے مجبور ہو کر استانی بنی کیونکہ اس وقت حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے مجبوراً یہ پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اور بھی کام تھے۔ مگر استانی بننا ہی مناسب خیال کیا۔ اس میں مجھے بہت سکھ ملتا ہے۔ ہر شخص اس دنیا میں سکون چاہتا ہے نا۔ سکون وہ سکون جو مجھے استانی بننے کے بعد میسر ہے"

انجلی ٹھیک کہتی ہے۔ یہاں ہر شخص سکھ کی تلاش میں ہے۔ سکھ ہی مقصد ہے اس زندگی کا۔ مگر انجلی نے سکھ کا راستہ یہ کیوں چُنا؟ اس نے کسی اچھے سے قابل نوجوان کے ساتھ شادی کیوں

نہیں کرلی۔ اس وقت نوجوان ہے۔ حسین ہے۔ کیا ایسا کرنے سے اسے راحت نہ ملتی؟ وہ تھوڑی سی کوشش سے اپنے لئے قابل شوہر کا انتخاب کر سکتی تھی۔ اسے مردوں سے نفرت تو نہیں ہے۔ عورت تو مکمل رہ سکتی ہے۔ بیوی بن کر اور ماں بن کر۔ لیکن اس نے شادی کیوں نہیں کی۔ کیا وہ دُنیا کے سامنے کوئی مثال پیش کرنا چاہتی ہے

دنودشنکر یہ پُوچھنا چاہتے تھے۔ مگر پُوچھ نہ سکے۔ ایک ایسی لڑکی سے جس کو وہ جانتے تک نہیں۔ ایسا سوال کس طرح سے کر سکتے ہیں اگر کوئی نوجوان ہوتا تو اس سے دریافت بھی کیا جا سکتا تھا۔ لہذا وہ اپنی بات دل میں دبا کر چُپ رہے

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ جھیل پر تاریکی کی سیاہ چادر سی پھیل رہی تھی "اب چلنا چاہیئے۔ وقت زیادہ ہو گیا ہے"

ساڑھی کا آنچل سنبھال کر انجلی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی "آج آپ کا بہت سا وقت ضائع کیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے شاید میں اسی طرح سے سکول کی لڑکیوں کا وقت ضائع کرتی ہوں گی۔ نہیں ان لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ہے۔ آپ کہاں جائیں گے؟"

"اب اور کسی طرف کو نہ جا کر سیدھا گوار تھی کو جاؤں گا"

"ڈاک خانے میں"

"جی"

"تو چلئے۔ اسی طرف راستے میں میرا بھی گھر ہے"

"چلیے۔"

پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے وہ مال روڈ پر آ گئے۔ "گلوب" کے آگے سے مڑ کر جب ڈاک خانے کی طرف مڑے، تو انجلی بولی "یہ رہا میرا مکان یہ سیڑھیاں آئیے۔"

"نہیں اب چلوں گا۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکے گا۔ چائے پی کر ہی جا سکیں گے آپ۔"

"لیکن . . . . ."

"لیکن ویکن میں نہیں جانتی۔ اگر میری دعوت قبول نہ فرمائیں گے۔ تو مجھے بہت دُکھ ہو گا۔"

ان کے انکار سے لالی کو دُکھ ہو گا۔ اور بہت دُکھ ہو گا۔ تو پھر وہ انکار کس طرح سے کریں۔ وہ لالی کے دکھ کا سبب نہیں بننا چاہتے۔ وہ بولے "چلیے۔"

انجلی کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کے مکان کے نیچے حلوائی کی دکان تھی۔ اس کو "کسان گھی کے پکوڑوں" اور چاٹ کی مکسڈ پلیٹوں کا آرڈر دے کر وہ دو شنکر کو ساتھ لے کر وہ اوپر چڑھ گئی۔ ماں انتظار کر رہی تھی۔ بولی "بڑی دیر لگا دی ہے تو نے! میں تو گھبرا رہی تھی۔"

"کیا کرتی ماں وہاں یہ دو شنکر جی مل گئے۔ ان کے ساتھ گپیں ہانکتے ہانکتے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔" اس نے مسکرا کر اپنی کشادہ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا

ونود شنکر کو ایسا معلوم ہوا جیسے کہیں دور باجے بج رہے ہیں

"ڈاکٹر ان پوسٹ ماسٹر صاحب! آؤ بھیا! دھنیہ بھاگ یہ! کل اگر آپ مدد نہ کرتے۔ تو ہمیں بڑا پریشان ہونا پڑتا۔ اور یہ لالی بڑی چنچل ہے بیا! بھلا اس کی وحشت کی بھی کوئی انتہا ہے۔ کھڑے کیوں ہو بھیا! بیٹھو نا سے اپنا ہی گھر سمجھو!"

بڑھیا کے حسن سلوک سے ونود شنکر بڑے متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک نئی ہی دنیا میں آپہنچے ہیں جہاں کے رہنے والے سب عجیب و غریب ہیں۔ انجلی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی بینت کی کرسی پر بیٹھ کر وہ دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں کی طرف دیکھنے لگے۔ اور کچھ سوچتے ہوئے بولے: "آپ کے ہاں مرد کوئی نہیں ہے کیا؟"

ماں بولی: "ہمارے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل سمجھئے۔ ایک لڑکا تھا وہ ان کے سامنے ہی چل بسا تھا۔ اور اس کے بعد وہ بھی ہمیں بغیر کسی سہارے کے چھوڑ کر چلے گئے۔ اور پھر ہم ماں بیٹی ہی رہ گئیں"

انجلی ساڑھی تبدیل کر کے آ گئی۔ بولی: "معاف کیجئے گا لیکن ابھی آپ کو تھوڑا سا انتظار اور کرنا پڑے گا۔ میں چائے تیار کرتی ہوں آپ تب تک ماں جی سے باتیں کریں۔ یہ بہت مزے دار کہانیاں سناتی ہیں۔ میں نے بڑے افسانے پڑھے ہیں۔ مگر ماں کی کہانی میں اور ہی مزہ ہے"

اور وہ مسکرا کر جانے لگی۔ ہاں اُسے پیار سے جھڑک کر بولی۔ "وہ بہت پگلی تو یہاں بیٹھ میں چائے تیار کرتی ہوں"

"نہیں تم ہی بیٹھو۔ میں ابھی پانچ منٹ میں چائے تیار کر کے لاتی ہوں۔ جھلو پکوڑے اور چاٹ لاتا ہوگا سے لینا" کہہ کر وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

دنود کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا وہ انجلی کو سمجھ نہ رہے تھے۔ آج تک دعوتیں تو بہت بار آئے گئے تھے۔ مگر دعوت انہوں نے کسی کی قبول نہ کی تھی۔ ہمیشہ ٹالتے ہی چلے آئے تھے۔ مگر آج وہ انکار نہ کر سکے۔ لیکن یہ سب کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چائے سے فارغ ہو کر ماں جی اور لالی سے اجازت لے کر دنود شنکر اپنے کوارٹر کی طرف چلے۔ کوارٹر میں پہنچ کر انہوں نے شب خوابی کا لباس پہنا۔ وشنو آگیا۔ "بولا یہ چائے لاؤں بابوجی"

"نہیں آج میں چائے نہیں پیوں گا۔ کھانا بھی نہیں کھاؤں گا وشنو! میں کھا آیا ہوں۔ تم کھا لو"

اور وہ اپنے بستر پر لیٹ گئے

وشنو سوچ رہا تھا۔ کہ کیا ماجرا ہے؟ آج تک تو کبھی ایسا ہوا نہیں تھا۔ کہ بابوجی کہیں سے کھانا کھا کر آئے ہوں

۲۲

اور جب تک دنود شنکر کو نیند نہ آئی وہ انجلی کے متعلق ہی سوچتے رہے

کیسی عجیب و غریب لڑکی ہے۔ وہ ایک ہی ملاقات میں اُن کو باندھ کر اپنی طرف کھینچ لینا چاہتی ہے۔ وہ دن میں وہ اُن کے قریب کھڑی ہو کر ان سے یہ کہ رہی ہے مجھے بھولنا نہیں۔ اور وہ خود شنکر کیا اسے بھول نہ سکیں گے

اپنی زندگی کے تیس سال انھوں نے تنہائی میں بسر کئے ہیں ان کو کسی عورت کے نزدیک ہونے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ وہ عورت سے دُور دُور ہی رہے ہیں۔ مگر کیوں ؟ کیا ان کے پہلو میں جو دل ہے وہ خالی ہے اور سوتا ہے یا کوئی چوٹ لگی ہوئی ہے اس پر !

مگر اب ! اب انجلی کیوں ان پر بُری طرح سے چھا رہی ہے۔ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتے۔ جا انجلی جا ! تو اپنی ماں کی گود میں بیٹھ کر راجکمار اور پریوں کی کہانی سُن ! کیوں ایک پُر سکون زندگی بسر کرنے والے نوجوان کے دل میں طوفان سا مچا رہی ہے تو استانی ہے تیرا کام ہے پڑھانا جن کو سمجھ نہیں ہے ان کو پڑھانا ہے تو پڑھائے چلی جا !

مگر انجلی استانی ہے۔ لالی تو نہیں۔ لالی ہے ایک شوخ لڑکی۔ اور وہ بھلا ایک خوبصورت سا کھلونا پا کر کیسے بھاگ جائے۔ کیوں بھاگ جائے

چھوٹے ماسٹر صاحب بستر پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مالک کو بستر سے اُٹھتا دیکھ کر ٹائگر بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ آج مالک نے ایسا کیوں کیا ؟ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ مگر وہ بند تھا۔ پھر ؟

سلیپر پہن کر دونوں شنکر کھڑکی کے پاس آئے۔ ان کا فیصلہ تھا۔ کہ وہ آج لالی کا کام تمام کر دیں گے۔ وہ اپنی زندگی اس طرح برباد نہ ہونے دیں گے۔ پُرسکون زندگی

سگرٹ وہ بہت کم پیتے تھے۔ جب طبیعت بے چین ہو۔ تب پیا کرتے تھے۔ انہوں نے سگرٹ سلگایا۔ اور کھڑکی کھول دی

رات گنہگار کے دل کی طرح سیاہ تھی۔ دُور پہاڑ پر بجلی چمک رہی تھی اور اس کا عکس جھیل کے پانی میں سے بھی دکھائی دیتا تھا۔

کتنی خوبصورت ہے لالی! کتنا پیارا نام ہے لالی . . . . لالی

انہوں نے سگرٹ کا ایک کش لگایا۔ پھر اُسے پھینک دیا نیچے غریبوں کی بستی ہے۔ ٹین کے مکانوں میں رہتے ہیں وہ۔ وہاں سے اب بھی ڈھولک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ بیچارے دن بھر سخت محنت کرتے ہیں۔ رکشا کھینچتے ہیں۔ بوجھ ڈھوتے ہیں۔ گھوڑوں کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ سماج کی اتنی خدمت کرنے پر بھی دُنیا انہیں ٹھکراتی ہے کیوں انہیں بھی تو زندہ رہنے کا حق ہے۔ پھر ان کو جینے کیوں نہیں دیا جاتا

ان میں سے کوئی بنسری بجا رہا تھا۔ سوز تھا اس کی لے میں وہ نغمہ کانوں کے راستے دل میں اُترا جا رہا تھا۔

اور عورت بھی تو ایک نغمہ ہی ہے نا، نغمہ شیریں، اس کا حُسن اور شباب قیامت ہی تو برپا کر دیتے ہیں نا، رُوح میں ہلچل مچا دیتے

ہیں۔ اور لالی کی آواز بھی تو بنسری کی آواز سے کم سریلی نہیں ہے۔ کیا اس کی آواز سُن کر مدہوش نہیں ہو جاتا انسان؟

پھر لالی؟ دنود شنکر نے کھڑکی بند کر دی۔ اب وہ بالکل نہیں سوچیں گے۔ بالکل نہیں سوچیں گے۔ وہ رات پھر پریشان رہ کر اپنی نیند خراب نہیں کرنا چاہتے

ٹائیگر سوچ رہا تھا کہ آج مالک کو کیا ہو گیا ہے۔ جب انہوں نے کھڑکی بند کی تو وہ ان کے پاس جا کر کوُں کوُں کرنے لگا۔ گویا زبان حال سے کہہ رہا ہو۔ کہ مجھ سے کہیں کہ آپ کو کیا دُکھ ہے۔ میں آپ کی بے چینی کا سبب سننا چاہتا ہوں۔ اور آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔

دنود شنکر نے سوچا کیسا وفادار جانور ہے۔ انسان کے سُکھ دُکھ کو سمجھتا ہے۔ آپ خوش ہوں گے۔ یہ بھی اچھل کود کر اپنی خوشی کا اظہار کرے گا۔ آپ دکھی ہوں گے۔ یہ بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آپ کی طرف دیکھے گا۔ ٹائیگر کی طرف دیکھ کر بولے "کوئی بات نہیں ٹائیگر! خیالات کی رو کے ساتھ بہا چلا جا رہا تھا" یہ کہہ کر انہوں نے پیار کے ساتھ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ دُم ہلا کر اُن کے سلیپر چاٹنے لگا۔

وہ پھر آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئے

بستر پر لیٹ کر انہوں نے سوچا کہ وہ بھول جائیں گے لالی کو۔ آج جو اُس نے انہیں چائے پر مدعو کیا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب تو نہیں

کہ وہ ان کی زندگی کی گاڑی کو ناہموار راستے کی طرف دھکیل دے۔
وہ اسے بھول جائیں گے۔ اُسے بھول جانے ہی میں ان کا بھلا ہے
اور وہ اس دن سرکاری کاغذات پر دستخط کرتے کرتے اُسے
بھول گئے۔ اور بالکل بھول گئے۔ وہ ان کو ایک بار بھی یاد نہ آئی۔
بھول کر بھی یاد نہ آئی۔ انہوں نے اس کی یاد کو کہیں دور پھینک دیا
جہاں سے آنا اس کے لئے ناممکن تھا۔
شام کو اپنے روزانہ پروگرام کے مطابق وہ چائے پی کر ایک ہاتھ
میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ سے ٹامگہ کی زنجیر تھام کر گھر سے نکلے
اور مال روڈ سے پارک میں پہنچے۔ اور پھر پاشان دیوی کا رُخ کیا
اس طرف لوگ کم آتے ہیں۔ وہ شنکر ایسے تنہائی پسند ہی اس طرف
آتے ہیں۔ جب وہ سمر ہاؤس کے قریب پہنچے۔ ٹامگہ زنجیر کو اپنی
طرف کھینچنے لگا۔
"نمستے"
حیران سے ہو کر بولے "آپ"
"جی میں ہوں انجلی! مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ بڑی دیر
سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں"
ایک جھنکار سے ملتی جلتی آواز اُن کو اپنے دل کے کونے میں سے
سنائی دی۔ وہ تو انجلی کو بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ پھر یہ یہاں کس
طرح سے آ پہنچی، ان کا انتظار کرنے کے لئے اپنے یقین کو ساتھ لے کر

بولے "ذرا سی دیر ہو گئی"

"کوئی بات نہیں۔ آپ سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ سوچا کہ آپ سیر کے لئے ضرور آئیں گے۔ اس لئے چلی آئی"

"جی میں ہر روز سیر کے لئے آتا ہوں۔ اگر شام کو چار دیواری کے اندر ہی مقید رہیں پھر زندگی دوبھر ہو جائے"

"خیر آپ کبھی چائینا پارک" گئے ہیں۔ بڑی دلکش جگہ ہے وہ سامنے ہی تو ہے۔ نینی تال کا نظارہ دیکھنا ہو تو وہاں سے دیکھئے۔ ایک طرف میدان دوسری طرف سلسلہ کوہ"

"آپ نے تو تصویر کھینچ کر ہی رکھ دی۔ اُستانی ٹھیریں، سمجھانے کے فن میں آپ کو کمال حاصل ہے مجھے "چائینا پارک" ٹہلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ مگر آپ نے مجھے یہاں کھڑے کھڑے ہی سیر کرادی"

"سُنا کرتی تھی کہ مرد عورت کو باتوں کے جال میں پھنسا لیتے ہیں عورت کی تعریف کی۔ اور اس کو بے بس کر دیا۔ لیکن اس کا ثبوت آج ملا کہنے والے نے سچ ہی کہا تھا" یہ کہہ کر انجلی نے قہقہہ لگایا

"یہ کیا؟ کیا میرا یہ مطلب تھا؟ کیا میں یہ کہنا چاہتا تھا ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بولے "میرا یہ مطلب نہ تھا۔ اگر میرے الفاظ سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ تو اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں"

انجلی اداس ہو گئی۔ میرے پاس بیٹھا ہوا یہ مرد کتنا بے حس ہے بولی "میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ شاید بُرا مان گئے"

کچھ سمجھتے ہوئے ونود شنکر مسکرائے۔ اور بولے "ہرگز نہیں"

دونوں مسکرائے

آج انجلی ان کے آنے سے پہلے ہی یہاں موجود تھی۔ اُن کے انتظار میں ان سے ملاقات کی اُمید میں، اس کو پختہ یقین تھا۔ کہ وہ آئیں گے۔ اور وہ ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آنکھیں بند کئے ہوئے لیکن کہیں اُسے پشیمان نہ ہونا پڑے۔ بھلا ونود شنکر سے اسے کیا مل سکتا ہے؟

شام کی تاریکی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ بوٹنگ کرنے والے اپنی اپنی کشتیاں کنارے کی طرف واپس لا رہے تھے۔ کیونکہ نینی تال کی جھیل میں غروبِ آفتاب کے بعد بوٹنگ کرنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔ لیکن ونود شنکر اور انجلی بات چیت میں مستغرق تھے۔ جب سردی بہت زیادہ ہو گئی تو انجلی نے کہا۔

"سردی کافی ہو گئی ہے"

ونود چونکے بولے "اوہ بہت دیر ہو گئی۔ باتیں کرتے ہوئے وقت کا خیال نہیں رہا۔ وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اب چلنا چاہیئے۔ چلئے آپ کی ماتاجی آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

انجلی ایک تاتل۔ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "آج میرا دل سے کہہ کر آئی تھی جانے کو طبیعت نہیں چاہتی مگر چلیئے۔ خواہش تو یہ ہے کہ

ہمیشہ ہی اس جگہ پہ بیٹھی رہوں۔ اور آپ سے باتیں کرتی ہوں۔
"مگر چاہنا اور چیز ہے۔ اوہ ہو تا" اور سٹے ہے۔ چلیئے"
انجلی نے جو کچھ کہا تھا اس کے متعلق سوچتے ہوئے ودود شنکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ عورت کے دل میں طوفان سا اٹھا ہوا ہے اور وہ اس وقت تھپیڑے کھا رہی ہے۔ مگر اس طوفان میں ودود شنکر کا بہ جانا کسی طرح سے بھی مناسب نہیں۔
دونوں چپ چاپ راستہ طے کر رہے تھے۔ نہ جانے دونوں کیوں خاموش تھے۔
اپنے مکان کے سامنے انجلی رک گئی۔ بولی۔ "اوپر چلیئے"
"آج . . . "
"جی ہاں ماں کھانا لئے بیٹھی ہوں گی آپ یہیں کھانا کھائیں گے میں نے سارا انتظام پہلے ہی سے کر لیا تھا۔ اور مجھے یقین بھی تھا کہ آپ کھانا ہمارے ہاں ہی کھائیں گے"
"مگر یہ تکلیف کیوں کی آپ نے؟"
"یہ تکلیف تو نہیں ہے"
"پھر بھی میں نے آپ پہ کوئی اتنا بڑا احسان تو نہیں کیا ہے جس کا بدلہ آپ اس طرح سے دے رہی ہیں آپ مجھے معاف ہی کریں تو بہتر ہو گا"
پھر جھگڑا؟ یہ آج پھر جھگڑا کریں گے مگر آج میں انہیں ایسا نہ

نہ کرنے دوں گی۔ مسکرا کر بولی " تو اس دنیا میں سب احسان کے بدلے میں ہی ہو رہا ہے۔ یہ تو محبت کا تقاضا ہے یہاں نہ تو کسی کو احسان کا ہی خیال ہے۔ اور نہ ہی اس کے بدلے کا ہی۔ ان باتوں کو چھوڑئیے۔ اس سے جھگڑے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے اور میں جھگڑا کر کے اپنے اور صاف حمیدہ کو کھونا نہیں چاہتی۔ یہ بازار ہے۔ اگر ہم یہاں جھگڑیں گے تو لوگ تماشہ دیکھیں گے۔ آئیے ادھر آکر جو کہنا ہو کہیں۔ یہاں نہیں، چلئے!"

ونود شنکر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ چپ چاپ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ماں منتظر تھی بولی "کہاں رہ گئے تھے بھیا؟ میں تو بڑی دیر سے راہ دیکھ رہی تھی"

ونود کے جواب دینے سے پہلے ہی انجلی بولی " آتے ہی نہ تھے زبردستی کھینچ کر لائی ہوں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر احسان کے بدلے کے متعلق تقریر جھاڑ رہے تھے۔ ماں! ان کا خیال ہے کہ ہم ان کے احسان کے بوجھ تلے دب کر ان کی اتنی خاطر کر رہے ہیں "

اب انجلی تو رکتی نہیں بولے " کیا بات ہے کیسی بات ہے؟ "

ماں بولی " نہ بھیا! ایسا نہ سوچو۔ ہم تمہارے احسان کا بدلہ بھلا کیا چکائیں گے۔ ایسا تو دنیا میں دستور ہے بیل جول سے محبت بڑھتی ہے۔ اس کے سوا دنیا میں اور رہے ہی کیا " اور ماں

کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ شاید شوہر اور بیٹا یاد آ گیا۔

دنو دبولے: "نہیں ماں یہ بات نہیں ہے۔ میں تو آپ کو پا کر خوش ہو رہا تھا۔ انجلی دیوی تو یونہی میری شکایت کر رہی ہیں!"

انجلی نے کہا: "دیکھو ماں! ذرا ان کی چاپلوسی!"

ماں نے میٹھی سی جھڑکی جھڑک کر کہا: "چُپ پگلی! اتنی بڑی ہو گئی مگر عقل بھگوان جانے کب آئے گی! پڑھائی کیا خاک ہو گی؟"

دنو دمسکرائے

۴

دنو دشنکر کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ اب وہ تنہائی پسند اور خاموش نہیں رہے۔ وہ ہر روز شام کو "چائینا پارک" میں پہنچ جاتے اور انجلی کو اپنا منتظر پاتے۔ اور ان کی یہ ملاقاتیں . . . . وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس مقام کو جہاں جا کر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہم چلے کہاں سے تھے۔

اور ان ملاقاتوں میں نہ جانے "آپ" کب "تم" میں تبدیل ہو گیا اور "انجلی" کب "لالی" بن گئی۔ ہاں "انجلی" سے زیادہ "لالی" میں شیرینی ہے

اب اکثر رات کو دنو دشنکر کو یہ کہنا پڑتا ہے "دشنو! تو کھانا کھانے نہیں کھا آ یا!"

دشنو شکایت کے لہجہ میں کہتا: "اور جو کھانا میں نے آپ کے لئے

تیار کیا ہے۔ اس کو کیا کروں؟"
"کسی بھکاری کو کھلا دینا"
وشنو مالک کا حکم بجا لاتا مگر اُسے تعجب ہوتا کہ مالک کہاں سے کھا پی کر آتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں۔ اور اتنی دیر کہاں لگاتے ہیں وہ کئی ماہ سے ان کے ہاں ملازم تھا۔ صبح کھانا کھا کر دفتر جاتے تھے۔ شام کو چائے پی کر سیر کے لئے جاتے تھے۔ رات کو کھانا کھا کر سو جاتے تھے۔ وشنو کو ان کی حالت پر ترس آیا۔ بے چارے خاموش سے رہتے ہیں۔ تنہا کوئی ساتھی نہیں۔ مگر اب ان میں انقلاب آگیا ہے۔ اب سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ پہلے دفتر سے آکر کافی دیر گھر میں ٹھیرے رہتے تھے۔ مگر اب آنے کے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں پہلے ہر روز گھر میں کھانا کھاتے تھے۔ مگر اب بیس دن باہر کھاتے ہیں رات کو دیر سے آتے ہیں کہاں رہتے ہیں کہاں کھاتے ہیں وشنو یہ سب جاننا چاہتا ہے۔ پھر سوچتا ہے ابھی عمر ہی کیا ہے کہیں لڑ گئی ہو گئی آنکھ۔ اور آنکھ لڑنے کے بعد دل بدلتے بھلا کونسی دیر لگتی ہے، ممکن ہے کسی دن لے آئیں ایک چھوٹی سی مالکن بھی!
سوچتا پوچھ دیکھیں۔ مگر پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوتا
ادھر ڈاک خانے میں کانا پھوسی شروع ہو گئی تھی۔ ارشد کہتا "دہی چھوکری جادو چلا گئی ہے پوسٹ ماسٹر صاحب پر! یار لڑکی بھی تو بلا کی خوبصورت ہے"

پنڈت گیان چند کہتے "ابھی نئی عمر ہے۔ دُنیا رنگین دکھائی دیتی ہے۔ جب ایک دن سب کچھ چھین جھان لے گی۔ تو پوسٹ ماسٹر صاحب ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

جوشی جی بولے "یہ بات نہیں ہے پنڈت جی! چھوکری کو معمولی خیال نہ کیجئے۔ سکول کی اُستانی ہے۔ خود کمال ہے۔ کھاتی ہے کھلاتی ہے اس میں لالچ نام کو نہیں ہے"

ارشاد کہتا "یار! اُن کے حساب میں بھی دو ہزار روپیہ جمع ہے۔ میں تو سُود کا حساب لگاتے لگاتے پریشان ہو جاتا ہوں۔ لیکن سوچتا ہوں کہ آخر وہ پوسٹ ماسٹر صاحب پر کیوں مری؟ ہم لوگ بھی تو تھے"

خوشی جی بولے "یار یہ نہ کہو۔ دل ہی تو ہے جس پر جا ہے آ جائے"

لیکن پنڈت گیان چند اپنی بات پر اڑے رہے کہنے لگے "تم لوگ چاہے کچھ ہی کہو۔ مگر میری بات یاد رکھنا۔ یہ استانی پوسٹ ماسٹر صاحب کو تباہ کر کے چھوڑے گی۔ اور ناکوں چنے چبوائے گی! تم لوگ سمجھتے کیا ہو؟ اُستانی وہ یونہی بن گئی ہے کیا؟ اس کی شکل و صورت سے ظاہر ہے۔ کہ وہ آفت کی پرکالہ ہے"

تو کہنے سے مراد ہے۔ کہ سب نے مان لیا۔ کہ ونود شنکر استانی کے جال میں پھنس گئے ہیں اور یہ بات ونود سے بھی چھپی نہ رہی جب اسے پتہ چلا۔ تو وہ ایک دن انجلی کا مکان بھی دیکھ آیا

مگر اُسے تعجب ہُوا۔ کہ مکان میں ماں بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے
تو پھر کہیں یہ دھوکہ تو نہیں ہے۔ اکثر ایسے ہی دھوکہ ہو جاتا ہے نا؟
مالک پردیسی ہیں۔ ایسی باتوں کو بھلا کیا جانیں؟
آخر کار وشنو نے ایک ہوشیار کھوجی کی مانند پتہ لگا ہی لیا۔ کہ استانی
کے گھر بہت سے آدمی آتے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے جوان ہے۔ حسین
ہے۔ کنواری ہے۔ پھر کیوں نہ آتے ہوں گے۔ مگر وشنو کو اس کے معصوم
چہرے کو دیکھ کر کہنے والوں کی باتوں پر یقین نہ آتا۔ مداح اور مخالف
ہر ایک کے ہُوا کرتے ہیں۔ مگر اس نے دنو کو کچھ کہنا مناسب خیال کیا
اس نے ایک دن اشارہ بھی کیا۔ مگر دنو شنکر کی ایک ہی مسکراہٹ
نے اس کے شکوک و شبہات کو رفع کر دیا
اور ڈاک خانے کے عملہ کو بھی دنو شنکر کے سامنے زبان کھولنے
کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ پنڈت گیان چند ایسے یا تو فی کیفی چُپ چاپ
اپنے کام سے ہی مطلب رکھتے تھے۔ دنو محسوس کرتے تھے کہ ان
کا عملہ ان کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کیا ان میں کچھ تبدیلی
آگئی ہے۔ وہ تو نہیں بدلے اور عملہ کی نگاہیں بھی نہیں بدلیں
یہ تو محض ان کا وہم ہے۔
ان کا نیا پروگرام جاری رہا

۵

دیوار پر بہت سی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ یہ سب تصویریں

انجلی کے والد کے وقت کی تھیں ۔ ان کو بدلا نہیں گیا ۔ سفیدی کروانے کے بعد بھی وہ اپنی پرانی جگہ پر لٹکا دی جاتی ہیں

ان میں سے ایک تو انجلی کے دادا کا فوٹو ہے بہت بڑے سائز کا سنہری فریم میں جڑا ہوا ۔ کس شان بیٹھے ہیں ۔ جیسے کہ کوئی راجہ ہو اس کی دائیں طرف اس کے پتاجی کی تصویر تھی ۔ حلیم الطبع خاموش پہلو میں ایک ایسا دل رکھتے تھے ۔ جو غیروں کے لئے بھی بےچین ہو جاتا تھا ۔

اور وہ رہی بھائی کی تصویر بے چارے اپنی زندگی میں کچھ بھی نہ دیکھ سکے بے وقت موت نے ان کو ہم سے چھین لیا ۔ اگر آج وہ ہوتے تو یہ سُونا گھر بھرا بھرا دکھائی دیتا بھاوج ہوتیں ۔ بھتیجے ہوتے ۔ بھتیجیاں ہوتیں ۔ ان کی موت کے وقت پتاجی کتنا روئے تھے پاگل ہو گئے تھے وہ ۔ اگر لوگ ان کو تھام نہ لیتے ۔ تو وہ یقیناً جھیل میں ڈوب کر خود کشی کر لیتے ،

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔ کمرے میں تین کھڑکیاں ہیں ہوا کے ڈر سے انہیں کھولا نہیں جا سکتا ۔ شیشوں میں سے جو چاندنی چھن چھن کر اندر آ رہی ہے ۔ ان سے کمرے کی ہر شے کو بقعہ نور بنا دیا ہے ۔ سامنے ، پلنگ پر ماں سو رہی ہے کتنے دکھ دیکھے ہیں اس نے ، کیسی دکھی ہے یہ ۔ ہائے

اس طرف کسی انگریز مصور کی چابکدستی کا نمونہ دو سینریاں

لٹک رہی ہیں۔ پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں بادلوں میں سے چاند جھانک رہا ہے۔ دُور چمنیوں میں سے دُھواں اُٹھ رہا ہے۔

نینی تال میں بھی سردیوں میں ایسے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں چاروں طرف دھند چھائی رہتی ہے۔ سردی کی وہ شدت ہوتی ہے۔ کہ خدا کی پناہ سب کام دھندا بند ہو جاتا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ تب وہ گھر ہی رہتی ہے۔ ایسی سردی میں کہاں جائے مگر دن بھر گھر میں بیٹھا رہنا اسے مشکل ہو جاتا ہے۔ ماں سے کہتی ہے چلو کہیں باہر چلیں۔ مگر ماں انکار کر دیتی ہے۔

تب وہ کہتی ہے۔ ماں اگر تو دُور نہیں جانا چاہتی تو چل المورٹے تک ہی ہو آئیں۔ رشتہ داروں ہی سے مل آئیں۔ مگر ماں پھر بھی انکار ہی کر دیتی ہے۔ اور وہ چُپ ہو جاتی ہے۔ ماں سے ضد کرنا وہ اچھا نہیں سمجھتی۔

اس کا لحاف ایک طرف کو سرک گیا تھا۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا جو آیا تو وہ کانپ اُٹھی۔ اس نے لحاف اچھی طرح سر کی طرف کھینچ لیا

دُنیا میں سب مٹ لُوٹ رہے ہیں مگر ایک وہ ہے بے بس اور مجبور سامنے ایک تصویر لٹک رہی ہے باغ میں ایک حسینہ بیٹھی ہے پودوں کی اوٹ میں کھڑا ہو کر ایک نوجوان پیاسی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور اس کی زندگی میں تاریکی ہی تاریکی ہے اور اس تاریکی

نے اس کے مستقبل کو بھی تاریک کر دیا ہے۔ کبھی کہیں کوئی ایسا واقعہ ہو گیا ہے۔ جس نے اس کے لئے زندگی اور اس کی تمام دلچسپیاں حرام کر دی ہیں

اور اسی کے نتیجے کے طور پر گلاس کو استانی بننا پڑا۔ وہ اس واقعہ کو بھول جانا چاہتی ہے۔ سکول میں ننھی ننھی لڑکیوں کے درمیان وہ خوش رہتی ہے۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ جو اسے پریشان کر رہی ہے

کملا نے اس دن اس کی چٹکی کاٹ کر کہا "سنا ہے آج کل بڑے گھرے رنگ میں ہو؟"

کملا انجلی کی سہیلی ہے۔ انجلی نے کچھ نہیں سمجھا۔ بولی "کیسا گہرا رنگ؟"

"اوہو اتنا بھی نہیں سمجھ سکی؟"

"تیری قسم جو کچھ سمجھا ہو تو"

"میری قسم! میری قسم کیوں؟"

"دیکھو اب مذاق چھوڑ نہیں تو تجھے دھکیل دوں گی ہڈی پسلی کا پتہ بھی نہ چلے گا"

"نہیں رانی نہیں اگر گروں گی تو سیدھی پوسٹ آفس میں اور وہاں سے پھر اپنے گھر"

"تو بڑی نٹ کھٹ ہے بات کیا ہے"

"یہ بات ہے تو اب روٹھ گئی تم؟ بتا رہی ہوں نا"

کملا ذرا رک کر بولی "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو"

"پر سچ کہو؟"

"تمہارے سامنے کبھی آج تک جھوٹ بولا ہے"

"وہ پوسٹ ماسٹر صاحب کون ہیں؟"

"کون؟"

"اب نہ بنو رانی؟"

"پوسٹ ماسٹر صاحب! کیا ہوا ہے انہیں؟"

"وہ نمبر ہاؤس" میں بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں! ہر روز شام کو میٹھی میٹھی چائے! میں اسی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں"

"نگوڑی!"

"سو تو کہو گی ہی۔ لیکن ایک بات کہوں مانو گی؟"

"کیا!"

"آدمی بُرے نہیں ہیں۔ میں نے بھی انہیں دیکھا ہے لگے ہاتھوں کر ڈال بیاہ بھلا کب تک اپنے ارمانوں کا خون کرتی رہے گی"

بملا نے دیکھا کہ اچانک انجلی اداس ہو گئی ہے، پوچھا "کیا بات ہے لالی؟"

"کچھ نہیں بملا! مگر کسی شخص کے حق میں اس طرح سے یکطرفہ فیصلہ نہ کر ڈالو۔ وہ تو دشنگر میرا ہاتھ میرا، اگر میں انہیں اپنا کر سکتی تو ضرور اپنا کر لیتی۔ مگر ان ہاتھوں میں کیا لکھا ہے"

"مگر سکول میں تو اس بات کا بڑا چرچا ہے۔ مس جوشی کا بھائی پوسٹ آفس میں ملازم ہے انہوں نے ہی یہ بات پھیلائی ہے اگر انسپکٹریس تک یہ خبر پہنچ گئی تو اس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ کوئی تدبیر کرنی چاہیئے"

"جب کچھ ہوگا تب دیکھا جائے گا"

ونود شنکر! وہ ونود شنکر کی طرف کھچی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ اُسکی طرف کھچے چلے آ رہے تھے۔ مگر کیوں؟ یہ وہ نہ جانتی تھی مگر وہ آپس میں ہر روز ملتے تھے۔

انجلی ———— یہ وادی پُر خار ہے سنبھل جا ———— مرد عورت کو کھلونا سمجھتا ہے ———— کھیلا اور دُور پھینک دیا ————

اور یہ سماج ———— سماج کے لئے عورت ہی قصور وار ہے۔ سماج مرد کو کچھ نہیں کہتا۔ مگر نہیں وہ ونود شنکر کو ضرور اپنا بنالے گی۔ اور اس کے لئے چاہے ان کو بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ بدنامی کیوں نہ سہنی پڑے۔ وہ اپنے ارمانوں کو نہیں کچل سکتی۔ لوگ کیا کہیں گے جو وہ کہیں گے وہ سن لے گی۔ وہ جو چاہتی ہے اسے حاصل کر کے رہے گی

اوہ! آج اسے کیا ہو گیا۔ آج وہ اس قدر پریشان کیوں ہے پڑوسی کے مکان سے گھڑی نے دو بجائے۔ اس کا سر بھاری

ہو رہا تھا۔ اور یہ پوٹے بوجھل ——— اس کی نیند کون چھین کر لے گیا؟ کون! کون!!

اس نے کروٹ بدلی

مگر نیند نہیں آئی

۶

"سنیئے!"

کون ہے۔ دلود شنکر نے سوچا۔ وہ سیر کے لئے جا رہے تھے۔ دیکھا ایک شخص سڑک کے کنارے کھڑا ان کو پکار رہا ہے پوچھا "مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو کیا؟"

"جی ہاں" اس نے نزدیک آ کر کہا۔

"کہو؟"

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا۔ تو آپ ہی تلک کے پوسٹ ماسٹر ہیں نا"

"جی آپ کا خیال صحیح ہے"

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

"شوق سے کہیئے"

"آپ شاید سیر کے لئے جا رہے ہیں"

"جی ہاں ہر روز جاتا ہوں"

"آپ کا وقت تو نہیں ضائع ہو رہا"

"اگر یہیں کھڑا رہا تو ضرور ہو جائے گا۔ اس لئے آپ نے جو کہنا ہو

کہہ ڈالئے"

"چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ بات بھی ہو جائے گی اور سیر بھی"

یہ کون ہے؟ اور ان میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ دونوں شنکر یہ جاننا چاہتے تھے۔ کون ہے یہ؟ عجیب سا دکھائی دیتا ہے۔ عجیب و غریب لباس ہے اس کا! کسی گاؤں کا رہنے والا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہاں شاید مزدوری کرنے کے لئے آیا ہے مگر اس کا بات کرنے کا ڈھنگ تو مزدوروں ایسا نہیں ہے

"آپ کی تعریف"

"یہ جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے؟"

"نہیں خاص ضرورت تو نہیں۔ مگر جان لینا اچھا ہو گا۔ اگر آپ نہ بتائیں تو پھر آپ کی مرضی"

"نہ کیوں نہ بتاؤں گا۔ کوئی وجہ بھی ہو۔ میرا نام بھلی رام ہے اور میں پہاڑی ہوں۔ میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مجھے نینی تال میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ اور مجھے جو پانا تھا پا لیا۔ آپ سے ملنے کی میری بڑی زبردست خواہش تھی۔ ڈاک خانے میں ملنا میں نے مناسب خیال نہیں کیا"

"آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہی کہئے۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت ہے"

مجھے افسوس ہے۔ خیر کیا کروں عادت ہی کچھ ایسی ہے میں نے سنا ہی
آپ ایک استانی سے محبت . . . . . "
"تم کیا بکتے ہو" ونود شنکر کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی
پہلے تو بیلی رام سہما پھر مسکرا کر بولا "آپ ناراض ہو رہے ہیں۔
مجھے آپ کی ناراضگی کی رتی بھر بھی پروا نہیں ہے" پھر اس نے
ذرا سخت لہجے میں کہا "اس بات سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے
کہ آپ کو انجلی دیوی سے محبت ہے"
ونود شنکر نے سوچا۔ کتنا حوصلہ اس شخص کا۔ بولے "یہ میرا پرائیویٹ
معاملہ ہے۔ اس میں دخل دینے والے تم کون ہو؟"
"میں اس سوال کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ مگر میں
آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر رہے
ہیں۔ آپ غلطی پر ہیں"
"میری محبت پاکیزہ ہے۔ اور مجھے اپنے آپ پر بھروسہ ہے۔
میری محبت میں نہ تو کسی غرض کو رتی بھر بھی دخل ہے اور نہ میں خواہشات
ہی کی رو میں بہنا چاہتا ہوں۔ سن لیا تم نے اب چلے جاؤ؟"
"مجھے آپ کی حالت پر رحم آتا ہے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب! آپ
جس چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ رہے ہیں۔ وہ سونا نہیں ہے آپ کی
بے غرضانہ اور پاکیزہ محبت پر مجھے کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ مگر میں
انجلی دیوی کے متعلق . . . . . . "

"انجلی کے متعلق میں تمہارے منہ سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔ تم جا سکتے ہو"

"آپ جوش میں آگئے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر صاحب! میں آپ سے بہت کچھ چاہتا تھا مگر اب نہ کہوں گا۔ میں تین چار روز میں اپنے گاؤں کو واپس جا رہا ہوں۔ اچھا نمستے"

اس نے ابھی اپنی بات ختم نہ کی تھی۔ کہ ونود شنکر "کمالیا سٹور" کے صدر دروازہ میں داخل ہو گئے۔ وہ اس شخص سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ انجلی کے بارے میں کسی کے منہ سے کچھ بھی سننا نہ چاہتے تھے۔ انجلی ایسا رتن! وہ اسے اچھی طرح سے پرکھ کر دیکھ چکے تھے۔ اور یہ شیطان کیا کہنا چاہتا تھا۔ شاید کوئی مطلب کی بات کہتا۔ مگر ایسے آدمی کام کی باتیں نہیں کیا کرتے

دکان کے اندر کھڑے ہو کر ونود شنکر یہ سب کچھ سوچ رہے تھے۔ جب سیلزمین نے آ کر کہا "کوئی خدمت" تب وہ سوچتے ہی رہے انہوں نے کہا "کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

سیلزمین نے جواب دیا "آپ اگر سنیں تو بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ ہمارے ملک میں . . . ."

"شٹ اپ" کہہ کر ونود شنکر دکان سے باہر نکل آئے۔ سیلزمین سوچ رہا تھا۔ کہ یہ شخص ضرور کوئی پاگل ہے۔

ونود شنکر جی! کیوں گھبرا گئے ہیں آپ۔ محبت میں تو بہت کچھ

چھپانا پڑتا ہے

"نہ جانے آپ آج اس وقت تک کہاں رہے۔ دیکھئے تو گھڑی میں کیا وقت ہے۔ پورے آٹھ!"

دنو وشنکر چونکے۔ واقعی آٹھ بج چکے تھے۔ رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

"ہیں آٹھ بج گئے؟" وہ بولے "راستے میں ایک عجیب سا آدمی مل گیا تھا۔ مجھے تو پاگل معلوم ہوتا تھا اس کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں"

"شکر ہے آپ آ تو گئے۔ چائے بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے منا مگر کہاں ہے؟"

"اس کو آج ساتھ نہیں لایا۔ چائے کی تم نے خوب یاد دلائی۔ آج شام کو چائے بھی نہیں پی۔ سیدھا اس طرف کو ہی آ رہا تھا۔ چائے ذرا جلدی گرم کر لاؤ۔ ماں کہاں ہے؟"

"کچن میں۔ اس کے گھٹنے میں درد ہے۔ سینک کر رہی ہے۔ آپ بیٹھئے میں ابھی چائے لاتی ہوں"

انجلی چائے لانے کے لئے چلی گئی۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگے بیوقوف کہیں کا وہ کیا جانتا ہے انجلی کو۔ مجھے پڑھانے آیا تھا

چائے کی پیالی میں چینی ڈالتے ہوئے انجلی نے پوچھا "آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ شادی شدہ لوگوں کی زندگی خوشی اور مسرت

کی زندگی ہے"

"مجھے اپنی زندگی میں کبھی شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی لالی!"

"کیوں؟"

"میں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں۔ کہ آدمی کے لئے شادی کرنا ضروری ہے۔ میں یتیم تھا۔ مجھے میرے رشتہ داروں نے پڑھایا۔ لکھایا۔ قابل بنایا، ملازمت بھی دلوادی۔ پہلے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پھر ملازم ہو گیا۔ دفتر چلا گیا گھر آگیا۔ اور شادی! شادی کے متعلق سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی"

"تو گویا آپ عورت کو محض ایک رسوئیا سمجھتے ہیں اس نے کھانا پکا دیا۔ آپ نے کھا لیا۔ بس عورت آپ کی خدمت کرنے کے علاوہ آپ کو ایک اور شئے بھی دے سکتی ہے۔ وہ ہے اپنی لازوال محبت عورت مرد کے رنج و راحت کی شریک ہے"

"ٹھیک ہے لالی! مگر مجھے اب تک اس کے متعلق کچھ علم نہ تھا"

"اور اب؟"

"اس اب کا جواب مجھ سے بہتر تم دے سکتی ہو۔ مجھے اس کے متعلق کہنے کی کچھ ضرورت ہی نہیں"

لالی کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں

"تو کیا......"

"میں اس قابل نہیں ہوں"

"میں یہ سننا نہیں چاہتا لالی! میں تمہیں چاہتا ہوں۔ میرے گھر اور میرے دل کا سونا پن تم ہی دور کر سکتی ہو لالی!"

اچانک انجلی کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ وہ جواب نہ دے سکی

"یہ کیا لالی! یہ آنسو کیسے؟ کیا بات ہے بولو؟"

"یہ مت پوچھو جیسے چل رہا ہے ویسے ہی چلنے دو" اور اٹھ کر جانے لگی۔ عین اس وقت اندر سے مالی باہر آگئی۔ بولی "کیا کروں بھیا! اس گھٹنے نے بڑا پریشان کر رکھا ہے اس سے تو موت اچھی ہے۔ گھل گھل کر اور تڑپ تڑپ کر مرنا تو بہت بڑی مصیبت ہے"

وشنو شنکر سوچنے لگے۔ لالی اٹھ کر کیوں چلی گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں بھر آئے ہیں کچھ سمجھ نہ سکے۔ بولے "اب درد کا کیا حال ہے ؟"

"اب تو کچھ آرام معلوم ہوتا ہے۔ بڑی دیر تک سینک دیتی رہی چلو بیٹھو گے نہیں"

"نہیں اب چلوں گا۔ دس بجے کو میں وشنو منتظر ہو گا۔ اچھا نمستے"

"نیلی رام! یہ نیلی رام کون ہے کہاں سے آیا تھا؟ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہ اس کا یقین نہ کرنا چاہتے ہیں۔ نہ کر سکتے ہیں۔ وہ اس کی

تم لوگ مانتے نہ تھے ۔اب کہو"

جوشی جی بولے "میں تم سے متفق نہیں ہوں جو کچھ تم سوچ رہے ہو وہ غلط ہے ۔معاملہ کچھ اور ہی ہے"

"اور کوئی بات نہیں ہے دو چار روز ٹھیرو ۔پتہ چل جائے گا"

کونٹر پر بہت سے آدمی آ گئے تھے ۔لہذا پنڈت گیان چند جی اپنے کام میں مصروف ہو گئے ۔

دفتر کا کام ختم کر کے، ونود شنکر گھر کی طرف نہ جا کر مال روڈ کی طرف چلے گئے ۔ان کی بیلی رام کو تلاش کر رہی تھیں ۔مگر وہ نہ ملا ۔انہوں نے کملا یا سٹور، چائنا پارک سب دیکھ ڈالے ۔مگر بیلی رام کہیں دکھائی نہ دیا سوچا چلو اب لاجی کے ہاں چلیں ۔مگر لالی کے مکان کے سامنے ان کے قدم رکے نہیں اور وہ بڑھتے ہی چلے گئے ۔اپنے کوارٹر کی طرف کوارٹر میں پہنچے ۔تو وشنو کو اپنا منتظر پایا ۔بولا "کہاں چلے گئے تھے بابو جی، میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا"

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا ۔تم کھا لو"

"میں کھانے کے لئے نہیں کہہ رہا بابو جی"

"پھر؟"

"استانی جی بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں"

"استانی جی؟"

"جی"

بلکہ میں سننا نہیں چاہتے، وہ لالی کو نہیں چھوڑ سکتے۔
مگر اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں بھر آئے تھے۔ ان آنسوؤں میں ضرور
کوئی راز پوشیدہ ہے کیا راز ہے وہ! میں اس قابل نہیں ......
مطلب کیا ہے اس کا...... نیلی رام سب کچھ جانتا ہے
"مگر کچھ سوچو! کیا تمہارا زندگی کا مقصد یہی ہے۔ محض رت اور شادی!
کیا تم اپنے سماج اور دیش کے کام نہیں آ سکتے۔ دیش کے متعلق تمہارا
کچھ فرض نہیں ہے کیا"
مگر میں کیا کروں۔ دیش کے لئے کیا کروں؟ کیسے کروں، مجھے راستہ
دکھاؤ نا.......

نیلی رام سب کچھ جانتا ہے
سونے کی کوشش کرنے پر بھی دلو دتشنکر سو نہ سکتے تھے۔ اور وہ اس
رات بے چین رہے۔
بھلی ہو یا بُری ہو کٹ جاتی ہے۔ رات دونوں کی
فرق صرف اتنا ہے وہ سوتے ہیں ہم فریاد کرتے ہیں
دوسرے دن دفتر میں بھی وہ اپنا کام اچھی طرح سے نہ کر سکے
ان کے ماتحت دیکھ رہے تھے۔ کہ آج وہ بہت اداس ہیں
دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔
پنڈت گیان چند جوشی جی کے پاس جا کر پھسپھسائے "دیکھ لو
پوسٹ ماسٹر صاحب کا چہرہ" ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ میں کہتا نہ تھا

"اچھا" کہہ کر وہ کوارٹر کے اندر چلے گئے۔ انجلی ان کے انتظار میں بیٹھی تھی ان کو دیکھ کر بولی "انتظار میں کب سے بیٹھی ہوں۔ انتظار میں واقعی ہی مزہ سا ہوا کرتا ہے آپ کی گھڑی کی بڑی سوئی کے ہر چکر میں اس سے پوچھتی ہوں "آئے" مگر وہ جواب میں چکر ہی لگائے جاتی ہے کیسے کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں تمہیدوں کا عادی نہ تھا۔ مگر تم نے بنا دیا ہے"

"خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ میں آج تمہیں تنگ کرنے آئی ہوں۔ تمہاری ناراضگی کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے مجھے دنیا میں کسی بات کی بھی پروا نہیں ہے۔ میں کبھی دُنیا کی پروا کرتی تھی۔ مگر اب نہیں کرتی اس دنیا کا یہ قاعدہ ہی ہے۔ اس کی پروا کرو۔ تو سر پر چڑھتی ہے۔ اس کے آگے دوڑو تو پیچھے بھاگتی ہے"

دلنود شنکر سوچ رہے تھے "کہ کیسی عجیب عورت ہے میں اسے سمجھ نہیں سکتا۔ روئی کی نرم بھی ہے۔ اور پتھر کی مانند سخت بھی ہے۔ وہ اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے

لالی نے کہا "اس ملک کا مرد، عورت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اسے خادمہ کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھ کر۔ یا اس کو گھر کی چار دیواری میں مقید دیکھ کر، اور عورت باغی ہو گئی ہے اس کے ظلم نے اسے باغی بنا دیا ہے۔ مرد اس کو باغی دیکھ کر اور بھی گھبرا اٹھتا ہے تڑپ اٹھتا ہے۔ اور سخت تنگ لگاتا ہے اس پر۔۔۔"

"مگر یہ اندیشہ مجھے کیوں ہے رہی ہو لالی! میں تو خود ہی عورت کو چار دیواری میں قید نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑیگا۔ اس لئے میری آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی ہے"

لالی مسکرائی "میں تقریر سنانے نہیں آئی ہوں شلوند۔ اور میں اس قابل بھی نہیں ہوں"

"بس بس رہنے دو یہی تو عورت کی کمزوری ہے اور اسی کے خلاف تم علم بلند کر رہی ہو نا؟ ہاں تو کیا کہنا چاہتی ہو"

"تم میری کل کی حرکت سے کچھ پریشان سے ہو۔ ایسا ہونا قدرتی تھا مگر میں مجبور تھی"!

"تمہاری وہ مجبوری ہی تو میری پریشانی کا سبب ہے کیا ہے وہ مجبوری؟ کیا مجھے نہیں بتاؤگی؟ میں محبت کے میدان میں ڈٹ جانا چاہتا تھا۔ اور تمہاری کل والی حرکت میرے لئے تو ایک پہیلی بن کر رہ گئی ہے"

"شلوند! ایک چیز ظاہراً طور پر جتنی خوبصورت ہے اندر سے بھی وہ ویسی ہی ہوگی۔ اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے۔ ہر بھلائی برائی میں لپٹی رہتی ہے"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا لالی! جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہو پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو"

"میں اپنی بدبختی کی داستان تمہیں سنانا چاہتی ہوں"

"تمہاری بدبختی"

"ہاں میری"

"تو مَیں نہ سُن سکوں گا۔ ہم جس راستے سے ہو کر منزل کی طرف جا رہے ہیں نا وہی ٹھیک ہے"

وشنو نے کمرے کے اندر داخل ہو کر کہا "کھانا لے آؤں؟"

"نہیں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ تم جاؤ"

وہ چلا گیا

لالی کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ ونود شنکر اپنی جگہ سے اٹھ لالی کے پاس آ گئے۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے "تمہیں کیا دکھ ہے لالی! اگر کہہ سکو تو کہہ ڈالو۔ دل کا بوجھ اتر جائیگا۔ مَیں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا"

اچانک لالی اپنا ہاتھ چھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی "بہت دیر ہو گئی ہے ماں انتظار کرتی ہو گی"

ونود شنکر کہتے ہی رہ گئے "لالی! لالی! ایک بات تو سنتی جاؤ" مگر تب تک وہ بہت دور جا چکی تھی

۸

لالی چلی گئی۔ اور ونود کا رہا سہا قرار بھی اپنے ساتھ لے گئی بھولی صورت والی، الہڑ لالی، ان کے لئے ایک معمہ بن گئی۔ اس کا ادھر آنا اور پھر چلے جانا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کون ہے جو اس کے

پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے چُپ پگلی بملا ونود تیرا کون ہوتا ہے۔ جو تو اس کے سامنے اپنے سب راز کھول کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ اگر ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ تو اسی طرح سے حاصل کئے جا۔ کچھ بتا کر کیوں؟

ونود تیرا کون ہے؟ انجلی مسکرائی۔ اور تیرا ہے بھی کون؟ کسی سے تیرا کیا رشتہ ہے۔ اس دنیا میں کسی کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔ اور اگر ہے۔ وہ ہے محبت کا رشتہ۔ اور وہی رشتہ محبت یہاں بھی ہے۔

انجلی اور خالہ دیکھ رہی تھیں

بملا نے ایک دن کہا تھا۔ لالی اگر تجھے دنود شنکر سے اس قدر محبت ہے تو کیوں نہیں ان سے شادی کر لیتی۔ ماں کو بھی اس میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ اور تو بھی، بھلا، کب تک اس طرح سے کنواری بیٹھی رہے گی"

لالی نے مسکرا کر کہا تھا۔ بملا! محبت کا انجام شادی ہی ہے کیا؟ میں ایسا نہیں سمجھتی"

بملا نے کہا تھا۔ سمجھتی تو میں بھی ایسا نہیں میں نہیں چاہتی کہ ہماری محبت معمولی سا افسانہ بن کر رہ جائے۔ لیکن جس سے پیار کریں اسے شوہر بنانے میں ہمیں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر میں نے یہ بات کہی تھی"

انجلی اس بات کا کوئی جواب نہ دے پائی تھی وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی

اس دن جھیل کے کنارے اس نے دنود شنکر سے کہا تھا آپ مثال

کے لئے ہمارے سامنے بھارت کی دیویوں کے سوانح حیات رکھ دیتے ہیں. ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں مگر کیا آپ لوگوں نے کبھی دیش کے مہاپرشوں کے سوانح حیات دیکھے ہیں ان سے کچھ سیکھا ہے۔ وہ زمانہ لاؤ۔ ویسے حالات پیدا کرو۔ ہندوستانی عورت کو بھی پھر ویسی ہی عورت دیکھ لو۔

دفود شنکر اس کے خیالات کو سن کر دنگ رہ گئے تھے۔ بات بھی ٹھیک تھی مرد اپنے تئیں درست کریں۔ عورتیں خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی عورت تو پیچھے چلنے والی ہے نا، مگر آج سارا الزام عورت کے سر تھوپا جا رہا ہے

دو تین دن سے جو کچھ ہو رہا تھا انجلی کو اس پر تعجب سا ہو رہا تھا وہ کوئی راز اگلنا چاہتی تھی۔ جس سے کہ وہ خود بھی ہلکی ہو جائے۔ اور دوسرے کے شبہات بھی مٹا دے۔

مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

ادھر دفود شنکر عجیب الجھن میں گرفتار تھے۔ لالی! تم میری ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ تمہارا کوئی کیسا ہی راز کیوں نہ ہو۔ مجھے اس کی رتی بھر بھی پروا نہیں ہے۔ میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔ اور نہ سنوں گا ہی۔ ماضی کو بھول جاؤ۔ ماضی کی یاد تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تاریخ ہمیں یہی سکھاتی ہے

دفتر کے کام میں اب ان سے متواتر غلطیاں ہو رہی تھیں۔ یہ

ان سے رفقا محسوس کر رہے تھے۔ پنڈت گیان چند تو ہر روز نئی نئی کوئی کہانیاں سناتے تھے۔ مگر ارشد کو ان سے دلی ہمدردی تھی نا معلوم کیوں

وہ وقت گزارنے کیلئے بہت دور چلے جاتے اور کسی چٹان پر جاکر بیٹھ جاتے پہلے دو چار دن وہ بیلی رام کو تلاش کرتے رہے۔ مگر وہ نہ ملا۔ وہ گتھی سلجھانا چاہتے تھے۔ مگر وہ اس دن کے بعد پھر دکھائی ہی نہ دیا۔ انہیں اپنے سلوک کے لئے افسوس تھا۔ اگر وہ ملتا تو اس سے معافی مانگ لیتے۔

اس دن کے بعد وہ انجلی سے بھی ملنے کے لئے نہیں گئے۔ سب پتہ نہ جانے وہ کیا سوچتی ہوگی۔ سنا بھی کہ لالی آئی تھی۔ اور آنے کے لئے کہہ گئی تھی۔ مگر پہاڑ کی طرف نکل جاتے۔ اور اس کے مکان کی طرف نہ جاتے۔

آج شام کو جس وقت وہ گھر پہنچے۔ تو اپنے معمول کے مطابق انہوں نے وشنو کو بلایا۔ اور پوچھا کہ "کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

وشنو بولا "آج بیلی رام نامی ایک شخص آیا تھا پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ شاید ملازمت کی تلاش میں آیا تھا"

"بیلی رام؟"

"جی ہاں بیلی رام، اس نے اپنا نام یہی بتایا تھا"

"تو نے اس سے یہ دریافت نہیں کیا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟"

"یہ تو میں بھول گیا"

"کچھ کہتا تھا؟"

"کہتا تھا۔ اس دن بابو جی سے ملا تھا مگر انہوں نے جھڑک دیا دوبارہ
مل نہیں سکا۔ گرنے کی وجہ سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے مجھے تو اس
پر بڑا ترس آیا ہے بابو جی"

"اس نے اور تو کچھ نہیں کہا؟"

"جی نہیں اور کچھ نہیں کہا" تھوڑی دیر تک چُپ رہنے کے بعد
وشنو پھر بولا" بابو جی"

"کیا؟"

"ایک بات کہوں؟"

"کہو"

"ناراض تو نہ ہوں گے؟"

"تو کہہ بھی؟"

"آپ استانی جی کا ساتھ چھوڑ دیں"

"کیوں؟"

"میں نے سنا ہے کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے بد نام۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر وہ تو وشنکر اس سے آگے نہ سن سکے بولے "جا اپنا کام کر اور سُن
لے کہ ایسی بات آئندہ کبھی زبان پر نہ لانا"

وشنو چپ چاپ منہ لٹکا کر چلا گیا کیسے سمجھائے بابو جی کو کہ
یہ استانی بری ہے بابو جی تو محبت میں اندھے ہو رہے ہیں محبت

بھی اندھی ہے اور جوانی بھی

لالی بُری عورت ہے۔ ونود شنکر سوچنے لگے۔ وہ بری ہے اس لئے کہ سماج کے رسم و رواج کو توڑ کر اپنے لئے الگ راستہ بنانا چاہتی ہے۔ بری ہے اس لئے کہ اتنی بڑی ہوگئی ہے اور اب تک شادی نہیں کی اور ملازمت کر کے اپنا گذارہ کرتی ہے۔ بری ہے اس لئے کہ وہ ان سے پیار کرنے لگی ہے؟ یا اس کی تہ میں کوئی راز پوشیدہ ہے؟ آخر بات کیا ہے بیلی رام کیا کہنا چاہتا ہے؟ وہ آج آیا تھا کل پھر آئے گا۔

۹

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

ونود شنکر اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں تاریکی پھیل رہی تھی چاروں طرف خاموشی مسلط تھی۔ ہاں ان کو اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی

کچھ دیر تک وہ بستر پر ہی بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے ٹائیگر بھی پلنگ کے پاس ہی سو رہا تھا۔ ونود شنکر کو اٹھتا دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے اسے زنجیر سے باندھ دیا۔ پھر اپنا اونی گرم ڈریسنگ گاؤن پہن کر دروازہ کھولا۔ اور باہر آ کھڑے ہوئے۔ ٹائیگر نے ان کو آدھی رات کے وقت باہر نکلتے دیکھ کر زنجیر توڑ کر ان کے ساتھ آنے کی کوشش کی۔ مگر زنجیر مضبوط تھی۔

تاروں بھری رات تھی۔ کہیں کہیں کوئی بادل کا ٹکڑا بھی دکھائی دے جاتا تھا

ایک بار آسمان کی طرف دیکھ کر دنود شنکر سڑک پر آ گئے۔ وہ سڑک جہاں سے بائیں طرف کو مڑتی تھی اس موڑ پر لالی کا مکان ہے لالی اس وقت سو رہی ہو گی۔ پری چہرہ لالی، اس کے لب لعلین اس کی زلف مشکین، اس کی کشادہ آنکھیں، انہیں ایسا معلوم ہُوا جیسے کہ سب کے سب انہیں کہہ رہے ہوں۔ آجاؤ! یہ سب کچھ تمہارا ہے تم نے اپنی چیزوں کو یونہی برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہے آجاؤ!

کہاں گئی تیری عقل پگلے اب بھی لوٹ چل! اب بھی لوٹ چل!

لوٹ جاؤں؟ کیوں؟ وہ مجھے پیار کرتی ہے اور میں لوٹ جاؤں؟

تو کیوں حسد کرتا ہے؟

حسد! حسد نہیں مجھے تجھ پر رحم آتا ہے۔ کیا تو واقعی جا رہا ہے؟ میں ہوں تیرا آتما میں ہوں تیری عزت! قدم روک آگے نہ بڑھ! کیوں مجھے ختم کر دینا چاہتا ہے

مجھے مار کر ہی تو تُو سکھی ہو سکوں گا تو میرے راستے کا کانٹا ہے، میں تجھے اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہوں پھر میں آزادی کے ساتھ اس دنیا میں رہ سکوں گا۔ مجھے تیری رتی بھر بھی پروا نہیں ہے

انہوں نے قہقہہ لگایا۔ اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اُن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ بے وقوف اب بھی دفع ہو جا!

دروازہ کھلا۔ سامنے ماں کھڑی تھی۔ حیران سی ہو کر بولی "کون پوسٹ ماسٹر صاحب! اتنی رات گئے یہاں؟"

"لا۔۔۔لی"

"اوہ لالی! اتنی رات گئے لالی کی کشش آپ کو یہاں کھینچ لائی ہے لعنت ہے آپ پر۔ مجھے کبھی خواب میں خیال نہ تھا کہ آپ اتنے نیچ ہوں گے۔ نہیں تو پہلے ہی دن آپ کو گھر سے باہر نکال دیتی۔ یہ ہماری ہی شرافت کا بدلہ دینے آئے ہیں نا آپ! مجھ ابلا کی عزت پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آیا ہے نا تو پاپی! ڈاکو!" ماں نے کہا

دلتو دشنا کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ مارے ندامت کے اب وہ سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ آج انہوں نے اپنی آتما کی آواز کو نہیں سنا اب وہ کیا کریں۔ کل صبح۔۔۔

"ماں!"

"مجھے ماں کہہ کر مت پکارو۔ ماں تمہارے منہ سے زیب نہیں دیتا۔ کس پھیر میں پڑ کر تم آج یہاں آئے ہو؟"

"پھیر۔۔۔۔۔۔"

"سنو کان کھول کر سنو۔ آٹھ سال گزرے۔ ہم تب گاؤں میں رہتے تھے۔ لالی بارہ برس کی تھی۔ ہم نے اس کی شادی بیلی رام نامی ایک

لڑکے سے کر دی تھی۔ مگر بیلی رام بڑا ہونے پر نکما اور آوارہ ثابت ہوا۔
لالی اسے چھوڑ کر چلی آئی۔ وہ ایسے شخص کی غلامی کرنا گناہ سمجھتی ہے
تم نے ایک دن مجھ سے دریافت کیا تھا۔ کہ میں نے لالی کا بیاہ کیوں
نہیں کیا۔ اس دن میں تمہاری بات کا جواب نہ دے سکی تھی۔ آج
دے رہی ہوں آج تم اس لالی کے لئے یہاں آئے ہو۔ لعنت ہے
تم پر!"

بیلی رام لالی کا شوہر ہے۔ لالی شادی شدہ ہے دلنود شنکر کو ایسے
معلوم ہوا جیسے ہزار بچھوؤں نے انہیں ڈنگ مار دیا ہو۔

بولے "ماں مجھے معاف کر دو"

"کس منہ سے معافی مانگ رہے ہو بابو دلنود شنکر جی؟ جاؤ! ابھی وقت
ہے۔ زیادہ شور ہونے سے محلے والے جاگ اٹھیں گے اور محلے والوں کے
جاگنے کے بعد کیا ہو گا۔ اس کا اندازہ مجھ سے بہتر تم لگا سکتے ہو۔ معافی
مانگنے سے بہتر ہے۔ چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جاؤ۔ مجھے خواب میں بھی
تم سے ایسی امید نہ تھی۔ جاؤ! اب یہاں سے چلے جاؤ! کبھی بھول کر
بھی ادھر کا رخ نہ کرنا" اور ماں نے اپنا دروازہ بند کر لیا

دلنود شنکر بت کی مانند کھڑے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ
آ رہا تھا۔ یہ خواب ہے کیا؟ نہیں یہ خواب نہیں یہ تارے یہ مکان
سب گواہ ہیں کہ یہ خواب نہیں ہے

ٹن ٹن ٹن کنہیا مہادو یالیہ کی گھڑی نے تین بجائے وہ سڑک پہ

آ گئے۔ آج انہوں نے عمر بھر کے لئے بد نامی کا بوجھ اپنے سر پر لاد لیا ہے
وہ چلتے بھتے لالی کو حاصل کرتے اس لالی کو جو اپنے شوہر کی بے عزتی
کر کے اسے چھوڑ چکی ہے وہ بھی کتنے نیچ ہیں

بیلی رام! بیلی رام سے لالی کی شادی صغیر سنی میں ہوئی تھی اب
ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کہاں کینیا مہا ودیالیہ کی مسٹرس
شریمتی انجلی دیوی۔ اور کہاں سبزی منڈی کا بوجھ ڈھونے والا مزدور
حالات کیا سے کیا بنا دیتے ہیں

ہیں! وہ تو جھیل کے کنارے پر آ پہنچے ہیں؟ کیوں؟ وہ جھیل پر
کیوں آئے ہیں اس جھیل کا ٹھہرا ہوا پانی ہمیشہ ہی ٹھہرا رہتا ہے۔
اس میں لہریں نہیں اٹھتیں۔ آدمی کی طرح سکھ دکھ کا اس پر کوئی
اثر نہیں تھوڑی دیر تک وہ جھیل کے کنارے کھڑے رہے پھر اپنا
ڈریسنگ گون اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور پانی میں اترے

کتنا ٹھنڈا ہے جھیل کا پانی

وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھے

جھیل میں کیوں جا رہے ہو۔ دنود شنکر جی؟ پانی بہت گہرا ہے
اور رات کے تیسرے پہر پانی میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں
ہے باہر نکل آؤ دنود شنکر جی! باہر نکل آؤ، گھر جاؤ۔ ڈاک خانے کا
کام دیکھو۔ دیکھو یہ مردانگی نہیں اس طرح سے خودکشی کرنا بزدلی ہے
بزدلی! نہیں بزدلی نہیں! دنیا میں۔ سماج میں اپنا کالا منہ

سے گر جانے کی بجائے بہتر ہے اپنے تئیں مٹا دوں

کل طلوع آفتاب کے بعد دنیا باتیں بنائے گی ان پر لعنت بھیجے گی۔ لوگ کہیں گے۔ کہ بابو دیو شنکر جذبات کی رو میں بہ کر گذشتہ رات کو ایک کمزور اور بیکس عورت کی عزت لوٹنے کے لئے اس کے مکان پر گئے تھے۔ دنیا کے سامنے وہ گردن نہ اٹھا سکیں گے۔ وہ جہاں جائیں گے۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔ دیو شنکر سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکے گا

انہیں ایسا معلوم ہوا۔ جیسے پہاڑ، تارے، درخت، جھیل کا پانی سب ان پر ہنس رہے ہیں اور ان کی ہنسی کانوں کے راستے اُن کے کلیجے کو چیرتی چلی جا رہی ہے۔ انہوں نے کانوں میں انگلیاں دبا لیں۔ بس اب نہیں سہا جاتا

وہ ذرا اور آگے بڑھے۔ پانی گھٹنوں تک تھا۔

"بھوں! بھوں!" یہ ٹائیگر کی آواز ہے۔ وہ بیچارہ اپنے مالک کو واپس بلا رہا ہے۔ واپس! وہ کیا جانے اس کا مالک آج ہمیشہ کے لئے اس پاپ کی بستی کو چھوڑ کر چلا جا رہا ہے۔ پیارا ٹائیگر! ان کا ساتھی!

اور لالی! کتنی خوبصورت ہے لالی اور کتنی حسین ہے یہ دنیا دونو ہی اپنے چاہنے والوں کو کچل کر پھینک دیتی ہے

تم نے دھوکہ دیا ہے۔ تم سے ایسی امید نہ تھی حسن اور شباب کو

دیکھ کر تم اپنے آپ میں آگئے۔ اور رات کے تیسرے پہر اس کے پانے کیلئے
تم نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خواہشات کے غلام! لعنت ہے تجھ پر

بدنامی! بدنامی!!

نہیں! نہیں! وہ اب زندہ رہ کر کیا کریں گے؟

مگر کیوں؟ تم نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے۔ جس کے سبب تم جان
دینے پر تیار ہو گئے ہو۔ اس سے بڑے بڑے گناہ، یہ دنیا والے ہر
روز کرتے ہیں لیکن وہ اپنی زندگی کو اتنا سستا نہیں سمجھتے۔ کہ ذرا
سی بدنامی کے خوف سے خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ لوٹ
جاؤ! لوٹ جاؤ! نند شنکر جی! لوٹ جاؤ!

نہیں! نہیں! میں تیری بات نہیں سنوں گا آج تو نے مجھے
کہیں کا نہیں رکھا۔

وہ آگے بڑھے۔ پانی کمر تک آگیا۔ اوہ! کتنا ٹھنڈا ہے یہ پانی!
ان کا جسم سُن ہونے لگا

دُور سے تانگے کے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی زنجیر سے آزاد ہونے کے
لئے۔ مگر اس کے مالک آج آزادی کے لئے جھیل میں ڈوبنے چلے
جا رہے ہیں

اور آگے بڑھے وہ۔ پانی سینے تک آگیا۔

دنیا تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہے۔ نند شنکر جی! دنیا کو چھوڑ کر
کیوں بھاگے جا رہے ہو۔ آؤ! آؤ۔ جھیل سے باہر نکل آؤ۔ دنیا کو دیکھو

اسکی خوبصورتی کو دیکھو۔لالی اور اس کی ماں کی باتوں کے پھیر میں پڑ کر اپنی زندگی برباد نہ کرو۔

لیکن اپنے منہ پر سیاہی مل کر وہ زندہ رہنا نہیں چاہتے وہ اور آگے بڑھے پانی گردن تک آگیا

پانی میں کون ہے؟ باہر نکل آؤ! آگے مت بڑھو نہیں تو ڈوب جاؤ گے!

دلدو شنکرجی! دلدو شنکرجی! یونہی جان نہ گنواؤ! دیکھو میں پکار رہی ہوں، میں ہوں تمہاری لالی!

مالک! مالک!

میں کہاں جا رہا ہوں کہاں جا رہا ہوں، نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے بچاؤ! میں ڈوبا جا رہا ہوں! میں نے کوئی پاپ نہیں کیا میں بے گناہ ہوں!

لیکن بابو دلدو شنکر آہستہ آہستہ پانی میں دھنسے چلے جا رہے تھے جیسے پانی میں بیٹھا ہوا کوئی انہیں نیچے سے ٹانگ پکڑ کر کھینچ رہا ہو اور جھیل کے کنارے پر کھڑا ہوا ٹانگہ گر سیو تک رہا تھا

لکشمی ریسٹورنٹ کرشن نگر لاہور

۱۳ر فروری ۱۹۴۶ء

کس کی جیت

"جیتو! جیتو! کیا ہُوا"

بوڑھی ماں کے دو تین بار دریافت کرتے پر بھی جیتو کی ہچکیاں نہ رکیں

بڑھیا نے نزدیک آکر آنچل سے اس کے آنسو پونچھے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کا سر اپنی بوڑھی چھاتی سے لگا لیا

"تو تو ساگ توڑنے گئی تھی۔ کھیت میں کسی سے جھگڑا ہو گیا کیا؟"

"نہیں ماں!"

"تو پھر؟" بڑھیا نے شفقت بھری نگاہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا

"میں نے ماں تجھ سے آج تک شرم کے مارے کچھ نہیں کہا تھا دیتا جو چوہدری دیوی سنگھ ہے آج آٹھ دن سے مجھے جس وقت اور جہاں

ملتا ہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا ہے۔ مانو اگر بس چلے تو مجھے گھول کر
پی جائے۔ میں سہم کر رہ جاتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ کسی طرح سے بچ کر
نکل جاؤں۔ مگر وہ یونہی جھوٹ موٹ کھانس کر مجھے سنا کر کہتا ہے
"ہر کارا ایک نظر ادھر بھی۔" اور جب میں خشمگیں نگاہوں سے اس کی
طرف دیکھتی ہوں۔ تو وہ اور بھی ناک چڑھانے کے لئے کہتا ہے "اوہو!
چاند بھی آگ برسانے لگا!! رام رام بھلا کریں۔" اور وہ اس طرح سے نامعلوم
کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے"

جیتو کی بات سن کر بڑھیا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مارے غصہ
کے اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں

"تو آج بھی اس موئے نے تجھ سے کچھ کہا تھا کیا؟"

"آج تو ماں اگر کہیں بجلو کھیت میں نہ پہنچ جاتی تو نہ جانے فساد ہو جاتا
میں نے ابھی ساگ کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ وہ بھی آدھمکا۔ آتے کے ساتھ
ہی کہنے لگا "میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ اپنی رنجیت کو۔ کہ کیوں؟" میں نے غصہ کو
دبا کر کہا "آپ میرے پیچھے اس طرح سے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہیں؟"
اس نے کہا "ایک بار مہاتما گوتم نے بھی بھگوان سے اسی طرح سے
کہا تھا۔ کہ مہاراج! دوہائی ہے! مجھے جو بھی دیکھ پاتا ہے بس اٹھا کر کھا جاتا
ہے۔ میرے ساتھ ایسی بے انصافی کیوں؟" بھگوان نے کہا "بھولی
بالی تیرے مشرف ہی آگیا ہے۔ اب تم جان بچا کر چلے جاؤ!"
"تیلی گئے کہا "بیٹے وہ تو بڑی مجھ پر رحم کرو"

اس نے کہا "اسے کہتے ہیں حسن اتفاق، یہی بات مَیں تم سے کہنے والا تھا۔ مجھے جلنے دو۔ رنجیت مَیں نے بہت سی راتیں تارے گن گن کر گزاری ہیں۔ میری سرمئی شامیں اماوس کی کالی راتیں بنتی جا رہی ہیں۔ تم چاند بن کر آؤ رنجیت!"

"اگر باڑ کھیتی کو کھانے پر اتارو ہو جائے۔ تو پھر کھیتی کا کہاں ٹھکانہ ہے؟ اور اگر کھیتی ہی باڑ کو نزدیک نہ پھٹکنے دے۔ تو اس کا کیا علاج؟ رنجیت یہی تو مَیں کہتا ہوں۔ کہ تم کسی کو اپنا بنا لو۔ اپنے شباب کی طرف دیکھو۔ کسی کو رکھوالا بنا لو۔ میں تو دن رات تمہارے ہی فکر میں گھلا جاتا ہوں ہی! ہی! ہی!"

"کوئی کیوں نہیں ہمارا بھگوان مر گیا ہے کیا؟"

"اور تمہارے بھگوان کو زندہ بھی کون کہہ سکتا ہے؟ یہ تمہارا گورا گورا بدن اس طرح سے میلا کرنے کے قابل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہمیں تمہاری فکر ہے۔ اگر وہ بھگوان اتنی سی بات ہم پر چھوڑ دے۔ تو ہم کیا تمہیں اس طرح سے بدکاریوں کی مانند چیتھڑوں میں ہی لپٹی رہنے دیں۔ ڈبیا میں ڈال کر رکھیں۔ اور سارے گاؤں کی چودھرانی بنا دیں" اتنا کہہ کر اس نے دس روپے کا ایک نوٹ میری طرف بڑھا کر کہا "اس وقت میری جیب میں صرف یہی ایک نوٹ ہے گی مجھ سے ......"

"آپ سے مانگتا کون ہے؟ ہٹا ڈالئے!" مَیں نے غصہ سے اس کا نوٹ اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ اس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا اب

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے ایک ہی جھٹکے سے بازو چھڑا لیا۔ اور اس کو ایک ایسی پٹخنی دی کہ وہ لڑھک کر پانی کے گڑھے میں جا پڑا۔ سب کپڑے پانی اور کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ بولا "جیتو یاد رکھنا یہ سلسلہ تم نے شروع کیا ہے۔ اب میرے وار کو روکنا پہلے تم میرے پیار کو دیکھتی رہی ہو۔ اب میرے غصہ کو دیکھنا"

"میں نے موقع کو غنیمت خیال کیا۔ اور وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی دوسرے کھیت میں بچنو ساگ توڑ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اور وہ بھی بچنو کو دیکھ کر کہیں ادھر ادھر چلا گیا"

اتنا کہہ کر جیتو پھر رونے لگی۔ بڑھیا اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ وہ اپنے مرحوم بیٹے رنبیر سنگھ (جیتو کے والد) کو یاد کر کے رونے لگی۔ وہ شیر، اگر آج زندہ ہوتا تو ان چوہوں کی کیا مجال تھی کہ سر اٹھا سکتے اگر کسی کی موت سر پہ کھیل رہی ہوتی تو وہ جیتو کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرات کرتا۔ جیتو کی طرف دیکھنے والے کی وہ آنکھیں نکال لیتا مگر اب جدھر گیا بیٹا ادھر گیا ہیو پارہ۔ مرد کی مایا اور درخت کا سایہ ساتھ ہی آتے ہیں اور ساتھ ہی چلے جاتے ہیں

بڑھیا کے رونے کی آواز سن کر پڑوس کے لوگ اکھٹے ہو گئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، طرح طرح کے خیالات کا اظہار کیا جانے لگا۔ کوئی آ کر کہنے لگا "کلجگ آ گیا بابا کوئی کسی کی عزت آبرو کا خیال نہیں رہا!

دوسرے نے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"بھیا بھگوان کسی کو عزت ہی کے ساتھ حسن اور شباب نہ دے۔ جہاں یہ تینوں چیزیں اکٹھی ہوئیں۔ وہاں جینا دو بھر ہوا"

"رام بھلا کرے! کون کہہ سکتا ہے۔ کل کس کے برے دن آ جائیں کبھی اس رنبیر سنگھ کی گاؤں میں طوطی بولتی تھی۔ اس وقت اس چوہدری دیوی سنگھ کا باپ دم دبائے پھرتا تھا۔ دن میں جتنی بار اس کے سامنے سے ہو کر نکلتا "متھا ٹیکا رنا جی" کہہ کر جاتا۔ وقت کا پھیر ہے"

"تو بھائی چوہدری دیوی سنگھ نے بھی کیا کہہ دیا۔ جو آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔" ایک اور آدمی نے آگے بڑھ کر چوہدری کی حمایت کرتے ہوئے کہا "کوئی ایسی تو بات چوہدری نے کہی نہیں۔ جیتنہ کمی دودھ ہوا نہیں اور چوہدری کسی نیچ ذات کا نہیں"

ارے یار شادی کی بات چیت باہر کھیتوں میں جا کر ہی کی جاتی ہے۔ سیدھی طرح سے یہاں آتا اور بڑھیا سے کہتا۔" ایک نے پہلے کی بات کاٹ دی

"لے چوہدری اگر چھوکری کا بیاہ ہو جائے تو بیٹھی راج کرے!"

"مگر کہتے کہ گھی ہضم نہیں ہوتا!"

"لونڈیا تو ابھی چھوٹی ہے۔ مگر یہ بڑھیا سٹھیا گئی ہے۔ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا!"

چھوکری کی راہ میں کانٹے بکھیر رہی ہے۔ آپ تو دریا کے کنارے کا درخت ہے۔ نہ جانے کب دم نکل جائے۔ پیچھے سے مٹھگتنا تو لونڈیا کو

پڑے گا!"

"بھیا! ہماری مانو تو جتنی جلدی ہو سکے لونڈیا کے ہاتھ پیلے کر دے چاہے اس چوہدری کے ساتھ چاہے کسی اور لڑکے کے ساتھ۔"

"ہاتھ پیلے کر دے!" ایک اور بولا "جیسے یہ بھی کوئی آسان کام ہو۔ کون پڑے گا اس جھگڑے میں۔ ہے کسی کی اتنی مجال جو چوہدری سے ساری عمر کا بیر مول لے لے"

"تو پھر چوہدری میں برائی بھی کونسی ہے؟"

"مگر اب وہ بھی مشکل ہی سے ملے گا!"

لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ اب انہیں چوہدری کے آگے ناک رگڑنی ہوگی۔ یا یہ چھوکری عمر بھر کنواری ہی رہے گی"

اس واقعہ کے بعد جیتو بہت کم باہر نکلتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چوہدری سے بیر مول لینے کے بعد اب اس کی عزت خطرے میں ہے

۲

کبھی دیوی سنگھ کے خاندان میں شرافت کا "چوہدری پن" تھا مگر اب وہ بات نہ تھی۔ دیوی سنگھ "لچا مارکہ" چوہدری تھا اور اس کے شہدے پن کے سبب سے ہی آس پاس کے دیہات میں اس کی دھاک جمی ہوئی تھی۔ پولیس کے بڑے بڑے افسر اس کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھے گاؤں بھر میں ایک۔ اسی کا مکان ایسا تھا۔ جس میں اعلیٰ قسم کا فرنیچر تھا۔ تھانیدار صاحب کبھی گاؤں میں آتے تھے تو اسی کے ہاں ٹھہرتے

تھے۔ پولیس والوں سے اس کی دوستی تھی۔ اور علاقے بھر کے چور ڈاکو اس کی مٹھی میں رہتے۔ اندر ڈاکو چوری کا مال لیکر بیٹھے ہوتے اور باہر چوہدری صاحب تخت پوش پر بیٹھے ہوئے پولیس آفیسروں کے ساتھ گپیں ہانک رہے ہوتے۔ چوری یا خوف بھی ان کے چہرے پر نام کو نہ ہوتا۔ شراب مرغوں، انڈوں اور گانے والی کا انتظام ہوتا۔ اور لطف یہ کہ یہ تمام اخراجات دوسروں ہی کی جیب سے پورے کئے جاتے۔ افسروں کے منہ کھلتے اور آنکھیں شرماتیں۔ اور اس طرح سے دیوی سنگھ کی مرضی کے بیان لکھ لکھوا کر معاملہ چلتا کر دیا جاتا۔ اس کے بعد محفل رقص و سرود جمتی، تاش اڑتی اور شام کو وہ چل دیتے۔ بس ہو گئی تفتیش مکمل بیگناہ گرفتار ہو جاتے۔ اور اصل مجرم بغلیں بجاتے پھرتے۔ اس لئے چوہدری سے سب ڈرتے تھے۔

پانچ روپے کا نوٹ ہتھیلی پر رکھ دیجئے۔ اور شام سے پہلے پہلے جس کی جی چاہے پگڑی اڑتی دیکھیئے۔ دس دلوا دیجئے۔ اور جس کا جی چاہے راستہ بند کروا دیجئے۔ اور پورے پچاس دے دیجئے تو کسی کو تباہ و برباد کروا دیجئے۔

اس کے پاس وہ چور رہتے۔ جو کہ منٹگمری اور لائل پور میں جا کر بیلوں گھوڑوں اور بھینسوں کی چوری کر کے انہیں دوسری منڈی میں لے جا کر بیچ آتے تھے۔ دوسرا گروہ ان ڈاکوؤں کا تھا۔ جو کہ راجپوتانہ کے ریتلے میدانوں میں چلنے والی گاڑیوں میں چڑھ جاتے تھے۔ اور جب گاڑی سٹیشن سے

بہت دور نکل آتی۔ تو اس میں سے کھانڈ، بادام، چاول اور کشمش کی بوریاں اٹھا اٹھا کر نیچے پھینکنا شروع کر دیتے۔ اور بعد ازاں بعد خود بھی اتر آتے۔ ریتلی زمین ہونے کی وجہ سے چوٹ تو ان کو لگتی ہی نہ تھی۔ تیسری پارٹی بردہ فروشوں کی تھی جو بڑے بڑے میلوں میں، سادھوؤں کا بھیس بنا کر چلے جاتے اور بھولی بھالی عورتوں کو پھنسا کر کسی کے ہاتھوں بیچ آتے۔ یہ تمام اشخاص اپنی آمدنی کا نصف حصہ بغیر کسی حیل و حجت۔ کے دیوی سنگھ کو دے جاتے تھے یہ سب باتیں بہت تھوڑے سے لوگوں کو معلوم تھیں۔ کیونکہ ظاہرا طور پر وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ اپنی بیٹھک میں موڑھے پر بیٹھا رہتا۔ اور دس بیس لچے شہدے ہر وقت اس کے پاس ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ گاؤں بھر کے مقدمات فیصلے کے لئے اس کے پاس ہی آتے تھے۔ کہیں بھائی بھائی میں کسی بات پر تو تو میں میں ہو گئی یا باپ بیٹے میں تکرار ہو گئی فیصلہ دیوی سنگھ کرے گا۔ اگر کسی کی بہو سے دال میں نمک زیادہ پڑ گیا۔ تو ساس اس کے ہاں ہی دوڑی آئے گی۔ غرضیکہ گاؤں بھر کا حاکم دیوی سنگھ تھا۔

بڑھیا رو دھو کر چپ ہو رہی۔ مگر جیتو کے لئے ور کی تلاش اس نے شروع کر دی

۳

بلبیر سنگھ ابھی چار ہی برس کا تھا جب یتیم ہو گیا۔ اس کی ایک پھوپھی تھی وہ اس کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اور اب یہ پل کر ایک خوبصورت

جوان ہو چکا تھا۔ کشادہ سینہ، لانبا قد، سرخ چہرہ، بلبیر سنگھ اب اپنی زمینداری
کو سنبھالنے کے لئے اپنی پھوپھی کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں میں آ گیا۔
گاؤں والوں نے اس کا شاہانہ استقبال کیا۔ اس نے گاؤں میں آتے
کے ساتھ اپنا نیا مکان بنوانا شروع کر دیا۔ دودھ پینے کے لئے ایک
بھینس خریدی اور سواری کے لئے گھوڑی۔ گاؤں والے بہت خوش
ہوئے۔ جیتو کی بوڑھی دادی نے جب بلبیر سنگھ کو دیکھا تو وہ بھی بہت
خوش ہوئی۔ اور اس نے بھگوان سے کچھ پرارتھنا بھی کی۔ اور ایک دن
جیتو کو ساتھ لے کر وہ اس سے ملنے کے لئے اس کے گھر بھی آ گئی۔ وہاں
جیتو اور بلبیر سنگھ کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر حسن پر عشق مچلا۔ دونوں نے
اپنے دلوں کو ٹٹولا۔ دلوں نے آنکھوں سے کچھ کہا۔ اور آنکھوں کی خواہش
ہوئی۔ کہ بس ایک دوسرے کو دیکھتے ہی چلے جائیں۔ اور یہ دیکھنا کبھی
ختم نہ ہو۔ اور پھر جب بڑھیا نے شادی کا ذکر چھیڑا۔ تو بلبیر سنگھ نے
سر جھکا کر ہاں کہہ دیا۔ یہ بات ہوا کے جھونکے کی مانند سارے گاؤں
میں پھیل گئی۔ گاؤں والے خوش بھی ہوئے۔ حیران بھی ہوئے۔ اور متفکر
بھی ہوئے۔ کہنے لگے بیچارے کو کیا خبر کہ ان کے ساتھ چوہدری کا جھگڑا
ہے۔ بڑھیا کی باتوں میں آ کر پھنس گیا ہے بیچارہ!" اور وہ بلبیر سنگھ
کو سمجھانے کے لئے دوڑے آئے۔ مگر اس نے سب کچھ سن کر کہا "میرے
منہ میں دو زبانیں نہیں ہیں۔ میں مرد ہوں۔ مرد اپنے قول کا پکا ہوتا
ہے۔ اپنے قول کے لئے میں دیوی سنگھ تو کیا شیر سے بھی بھڑ سکتا ہوں!"

بڑھیا کا دل دھڑک رہا تھا۔ کہ کہیں لوگوں کے کہنے سننے سے بلبیر انکار نہ کردے۔ لہٰذا اس نے کوئی آٹھ دن کے بعد جیتو کے ہاتھ پیلے کردیئے

بلبیر کھیتوں میں جا کر ہل چلاتا تا۔ اور رنجیت کور دوپہر کے وقت اس کا کھانا لے کر جاتی۔ کتنی لذت تھی اس کھانے میں۔ رنجیت کور اب ایک شیرنی کی مانند گاؤں میں گھومتی پھرتی تھی۔ مانو جیسے وہ کوئی رانی ہو۔ دیوی سنگھ کے سامنے سے وہ اس طرح سے سینہ تان کر نکلتی تھی جیسے کہ کہہ رہی ہو۔ میں نے فتح حاصل کرلی ہے۔ دیوی سنگھ زخمی سانپ کی طرح اندر ہی اندر بل کھا کر رہ جاتا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اگر وہ چاہتا تو یہ کام اپنے کسی بدمعاش ساتھی کے سپرد کرسکتا تھا۔ مگر اس طرح سے ایک تو اس کی بدنامی تھی دوسرے دنا دانا دشمن تھا۔ وہ زہر کی جگہ گڑ دینا بہتر خیال کرتا تھا۔ گاؤں والوں کا خیال کچھ اور ہی ہوگا۔ مگر وہ پہلے کی مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے رام رام کہتا تھا۔ اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ بیٹھک میں لے جاکر اسے اپنے ساتھ بٹھاتا تھا۔ اور اس طرح سے لوگ اس کو "چھوٹا چوہدری" کہتے تھے

اس کے اس قسم کے سلوک کو دیکھ کر کوئی کہتا دیوی سنگھ ڈر گیا ہے اور کوئی کہتا دیوی سنگھ کا بیر رنجیت کور سے ہے بلبیر سنگھ سے نہیں۔ اور کئی آدمی جن کو بلبیر سنگھ سے بڑی بڑی امیدیں تھیں ان دونوں کو شیر وشکر دیکھ کر کہتے "بھیا نمک کی کان میں جو گیا نمک ہو گیا" اور دو چار

ایسے بھی تھے جو یہ کہتے تھے کہ یہ دیوی سنگھ کی چال ہے یہ کسی المیہ ناٹک کا پہلا سین ہے

بلبیر سنگھ کے گھل مل جانے پر دیوی سنگھ اسے میلوں ٹھیلوں میں بھی لے جانے لگا۔ جب یہ دونو مکلف لباس پہن کر گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر نکلتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کہ رام اور لکشمن کی جوڑی جا رہی ہو۔ میلے میں جا کر دیوی سنگھ تمام خرچ اپنی جیب سے کرتا۔ اور بلبیر سنگھ کا ایک پیسہ نہ خرچ ہونے دیتا بلبیر سنگھ جب گھر آ کر دیوی سنگھ کی فراخدلی کے قصے بیان کرتا تو رنجیت کور چپ رہ جاتی۔ کچھ کہنا چاہتی مگر بات زبان پر آ کر رک جاتی

اس گاؤں میں چمپا نامی ایک آوارہ عورت بھی رہتی تھی جس نے گلا خوب پایا تھا۔ آواز میں جادو تھا۔ کسی زمانہ میں وہ شہر کی کسی تھیٹریکل کمپنی میں بحیثیت ایکٹریس تھی۔ مگر جب دیوی سنگھ کے باپ کو ان کا ناچ اور گانا پسند آیا تو وہ اسے ساتھ ہی لے آیا۔ تب سے وہ یہیں کی ہو رہی۔ چمپا پری چہرہ بھی تھی۔ حسینہ بھی تھی۔ ساحرہ بھی تھی۔ ملکہ رقص بھی تھی۔ گاؤں والے کہتے تھے۔ کہ چمپا میں حسن، راگ اور رقص نے جنم لیا ہے۔ یہی چمپا دیوی سنگھ کا دایاں ہاتھ تھی۔ جو کام دیوی سنگھ کی پہنچ سے باہر ہوتا وہ اسے بڑی آسانی سے کر دیتی۔ دیوی سنگھ نے جب دیکھا کہ کام نہیں بنا۔ کوئی چال کارگر نہیں ہوئی۔ اور میری ترکش کے تمام تیر ختم ہو گئے ہیں تب اس نے اسی کمند کو پھینکنے کی ٹھانی جب اس نے

چمپا سے امداد کے لئے کہا تو وہ چھاتی ٹھونک کر بولی: آپ کو اس کے لئے تفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسی ایسی چھوکریوں کی بساط ہی کیا ہے میرے سامنے؟ میں ہاتھی کا بوجھ اٹھا سکتی ہوں!

مگر اسے بھی منہ کی کھانی پڑی۔ اس نے جتنے بھی وار کئے سب پتھر کی چٹان پر گئے۔ اب اس نے دوسرا پانسہ پھینکا۔ اس نے رنجیت کور کا خیال چھوڑ کر بلبیر سنگھ کو اپنے جال میں پھنسانے کی ٹھانی

دیوی سنگھ کی بیٹھک میں اب ہر روز چمپا کا ناچ اور گانا ہونے لگا خوب دور چلتے۔ بلبیر سنگھ کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا۔ چمپا دیوی سنگھ کے اشارے سے مے ارغوانی کا جام اس کے ہونٹوں تک لے جا کر کبھی یہ گانا گاتی ؎

پی لے۔ مورے راجہ، پی لے

اور کبھی گاتی ؎

پگھلی ہوئی جنت پی لے

کلیوں کی عصمت پی لے

بلبیر سنگھ کبھی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتا کبھی اپنا سر تکئے میں دے لیتا۔ مگر چمپا بار بار پیالہ اس کے منہ تک لے جاتی کبھی کہتی ؎

پینے کا زمانہ آیا ہے

جینے کا زمانہ آیا ہے

اور ایک دن اس نے یہ کہہ کر کہ ؎

ہم نے تو آج پلانے کی قسم کھائی ہے

گلاس اس کے ہاتھ میں دے ہی دیا۔ وہ بھی کچھ دیر تک گلاس ہاتھ میں لے کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر جب چمپا نے کہا کہ ؎

پی اور مزے لے پی ،

یہی ہے زندگی

تو وہ گلاس ہونٹوں تک لے گیا۔ اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔ شراب گلے اور سینے کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔ محفل پکار اٹھی "شاباش شاباش"!! بلبیر سنگھ کڑوی ہونے کے سبب سے منہ بنا رہا تھا۔ کہ دیوی سنگھ کے اشارے سے چمپا نے انار کلی لاہور کے حلوائیوں کی مشہور دکان کے گھی میں تلے ہوئے دال موٹھوں کی پلیٹ آگے کر دی۔ اب بلبیر سنگھ کو سرور جو آیا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ میں آج تک اس نعمت عظمیٰ سے کیوں محروم رہا۔ کتنے بیوقوف تھے وہ رشی منی جو اس کی مذمت کرتے رہے۔

بلبیر سنگھ میں اب بڑی بھاری تبدیلی آگئی۔ ہر روز رقص و سرود کی محفلیں جمنے لگیں۔ اب اسے رنجیت کور اپنے دل سے اترتی ہوئی دکھائی دی۔ اب اس سے گھر میں بیٹھا نہ جاتا۔ آتا اور نکل بھاگتا۔ رنجیت کور کو اپنے سنہرے سپنے ہوا ہوتے نظر آنے لگے۔ اس نے شوہر کو سمجھایا مگر اس کو تو چمپا کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ پانی سر پر سے گذر چکا تھا۔ بلبیر سنگھ کو رنجیت کور کی رتی بھر بھی پرواہ نہ رہی

رات اندھیری تھی۔ گھٹا ٹوپ ابر تھا۔ بجلی بار بار چمک رہی تھی کیڑے مکوڑوں کی وحشت ناک آوازوں سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ ڈر اور خوف کے عالم میں بے بس و تنہا رنجیت کور بار بار اپنا منہ لحاف میں چھپا لیتی تھی۔ اور کبھی ذرا سی آہٹ پر دیوانہ وار چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی تھی۔ لیکن کوئی مونس و غمخوار دکھائی نہ دیتا تھا۔ جب طبیعت ضرورت سے زیادہ پریشان ہونے لگی تو وہ رونے لگی۔ اس نے بھگوان سے پرارتھنا کی ہے ناتھ! تم نے ایک بار دروپدی کی لاج بچا دی۔ آج میری بھی وہی حالت ہے شوہر سے مجھے کسی قسم کی کوئی امید نہیں رہی۔ اب تم ہی میرا سہارا ہو پربھو!

۴

چھمیا نے کہا بھیجا۔ کہ آج وہ بیمار ہے آج اس کا گانا نہ ہوگا۔ بلبیر سنگھ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سامنے سے کسی شمع ہٹا کر بجھا دی ہو اس کو اپنی زندگی سے نفرت ہو گئی۔ سوچا کہ میں بہت گر گیا ہوں اب سنبھلنا چاہیئے۔ وہ گھر جا کر بیٹھ رہا۔ اسے کچھ اچھا نہ لگتا تھا

مگر چار دن بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اس کے قدم خود بخود باہر کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ رنجیت کور پورے دلوں سے تھی اس نے جب اسے اس طرح سے جاتے دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر ملتجی ہوئی "آج کہیں نہ جاؤ! آج نہ جانے کب . . . .

بیچاری نے ابھی اپنی بات بھی ختم نہ کی تھی۔ کہ بلبیر سنگھ گرجا" تو پہلے

کہتی! میں کسی دائی کو بلا لاتا۔ ٹھیک اس وقت کما۔ جب مجھے باہر جانا ہے موقع تاڑ رہی ہو گی! میں سب سمجھتا ہوں! یہ سب مجھے روکنے کے بہانے ہیں! مجھے کل وقت پر یاد دلانا۔ میں سارا انتظام کر دوں گا!" یہ کہہ کر تیر کی طرح باہر نکل گیا

ہائے رے ظالم مرد! حسن کے پجاری! محبت کی قدر کیا جانیں؟ جو عورت کا دکھ سکھ سمجھے وہ دل ان کے پاس کہاں! بدنجیت کو رکو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی! اس کی امید کی آخری کڑی بھی ٹوٹتی معلوم ہوئی

بلبیر سنگھ، سیدھا چمپا کے مکان پر گیا۔ چمپا اس وقت اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اس نے آئینے میں بلبیر سنگھ کا عکس دیکھا۔ جھوم اٹھی۔ مگر اسی طرح کنگھی کرتی رہی۔ بلبیر سنگھ نے آکر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس نے ایک کل کی مانند حرکت کی، گھومی اور پھر اپنے بالوں کا پھندا بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اس کے گالوں پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر بولی "کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری آگر پوچھ جاتے تو مہندی اتر جاتی یا زبان گھس جاتی؟ بس دیکھ لی تمہاری محبت!"

بلبیر سنگھ نے کہا "بچپن میں پھوپھی کہا کرتی تھیں کہ بنگال کی عورتیں مردوں کو مکھی بنا کر دیوار کے ساتھ چپکا دیا کرتی تھیں۔ اور اب یہ حال میں اپنا دیکھ رہا ہوں واقعی پھوپھی سچ فرماتی تھیں۔ اب تم کہو تمہارا حال

اچھا ہے نا؟
چمپا نے بالکل ڈرامائی انداز سے کہا۔ بکری کی جان گئی اور کھانے والے کو لذت نہ آئی ۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

مجھے پیارے بلبیر سچ پوچھو تو بیماری تمہاری ہے جان کی قسم تم نے میرے سینے میں وہ آگ لگا دی ہے کہ ۔

آگ کچھ ایسی لگی ہے کہ بجھائے نہ بجھے

"کاش میں بجھا سکتا؟"
"تو کیا کرتے؟"
"مہاراجہ مگر تمہاری اس آگ کو بجھا دیتا"
"شکریہ! یہاں ملہار کی ضرورت نہیں"
"تو؟"
"تمہارے دیدار کی ضرورت ہے"
"ہم حاضر ہیں"

ادھر حسن اور عشق کا ناٹک کھیلا جا رہا تھا۔ ادھر بے چاری رنجیت کور اکیلی کھاٹ پر پڑی کراہ رہی تھی۔ مارے درد کے برا حال تھا سوائے مہاراجہ کے اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ آدھی رات کے وقت اس کا چھٹکارا ہوا۔ وہ نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی۔ صبح ہوش آنے پر دیکھا کہ

لڑکا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور اپنی بادام ایسی، موٹی موٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی پھول کو بھگوان نے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں لگا کر بھیج دیا ہو

ایک مدت سے رنجیت کور کی امیدوں کے چراغ بجھ بجھ کر خاموش ہو چکے تھے۔ مگر اس ننھے منھے سے چراغ نے ایک ایک کر کے ان چراغوں کو ایک بار پھر جلا دیا۔ اور اس روشنی میں اس کو دنیا پھر روشن نظر آنے لگی۔ اس کی زندہ رہنے کی خواہش پھر جاگ اٹھی۔ اپنے لئے نہیں اس بچے کے لئے۔

چوہدری دیوی سنگھ بدھائی دینے کے بہانے ایک دن لوٹ لینے کے لئے آیا۔ بدھائی دینے کے بعد بولا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں"

"آپ کے ہوتے ہوئے کیا تکلیف ہو سکتی ہے"

"اگر کہو تو میں اب بھی حاضر ہوں"

رنجیت کور کو مالو بھالا سا لگا۔ بولی "پہلے بھی تو آپ ہی کی مہربانی تھی چوہدری! پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا ہے اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیئے"

دیوی سنگھ کٹ کر رہ گیا۔ وہ اس کے گھمنڈ کو توڑنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ رسی جل چلی ہے۔ مگر بل جل سکے تو بل ہیں اسے مسل کر راکھ کیا جا سکتا ہے۔ مگر بل نہیں کھل سکتے۔ وہ اپنی کمزوری پہ کڑھتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

۵

بلبیر سنگھ جو کبھی شہزادہ سا دکھائی دیتا تھا۔ اب عجیب حال میں ہے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، گال پچکے ہوئے، بال لمبے ہوئے، رنگ زرد، ہڈیوں کا پنجر، پھونک مارو تو ہوا میں اڑ جائے۔ نقاہت اور کمزوری رگ رگ، ریشہ ریشہ سے ٹپک رہی ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دیکھنے والے کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اور اس کو خود اپنی یہ حالت دیکھ کر رونا آتا تھا یا کہ نہیں یہ کون کہہ سکتا ہے بری صحبت میں بیٹھ کر اس نے اپنی تمام دولت ختم کر ڈالی تھی۔ اب وہ ٹھیک ایسا شخص تھا۔ جس کے لئے نہ تو کوئی اپنا پروگرام تھا۔ اور نہ کرنے ہی کے لئے کوئی کام تھا۔ چابی دو تو چل پڑے گا۔ چال ختم ہو جائے گی تو رک جائے گا۔ اسے شراب کے دو گھونٹوں سے مطلب تھا۔ اور بس مگر اس کا ملنا بھی تو اب مشکل نظر آتا تھا چمپا اسے خالی ہاتھ آتے دیکھتی تو نفرت سے منہ پھیر لیتی۔ اب اس کا کون ٹھکانہ تھا۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا! گھاٹ پر اسے اب کوئی پوچھتا نہ تھا۔ البتہ گھر پر اسے ضرور سکھ مل سکتا تھا۔ مگر گھاٹ، گھاٹ کا پانی پینے والے کو، گھر کا پانی کہاں اچھا لگا کرتا ہے؟

چمپا نے اسے ایک تانگہ گھوڑا بنوا دیا تھا۔ وہ گاؤں سے شہر کے دو تین پھیرے لگاتا۔ اور جو کچھ ملتا چمپا کی ہتھیلی پر رکھ دیتا اور اس کے بدلے میں اسے دو گھونٹ شراب دے دیتی یا اس کے گال پر اپنے نازک

ہاتھوں سے دو تین چپتیں لگا دیتی۔ وہ کبھی کبھی اپنے گھر کی طرف بھی دیکھتی
اور رنجیت کور کے پاس جو کچھ تھوڑی بہت نقدی ہوتی چھین لاتا۔ بچہ
اب "بابا" "ماں" کہنا سیکھ گیا تھا۔ وہ جب اسے گھر میں داخل ہوتا دیکھتا
تو توتلی زبان میں "بابا بابا" کہہ کر اپنی باہیں پھیلا دیتا۔ مگر وہ نفرت سے
منہ پھیر کر کہتا، "بدبخت جس دن سے تو آیا ہے دنیا بھر کی مصیبتیں ساتھ
لایا ہے!" یہ سن کر ماں کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ وہ اسی بچے کے سہارے
اڑتی پھرتی تھی۔ لوگوں کا کام دھندا کرتی، ان کے برتن مانجتی، کپڑے
دھوتی، آدھی آدھی رات تک چکی پیستی اور اس کے بدلے میں لوگ اسے
پھٹے پرانے کپڑے، باسی روٹیاں اور بچے کے لئے تھوڑا سا دودھ دے
دیتے۔

رنجیت کور کے لئے ہر صبح کی پہلی کرن ایک نئی مصیبت کا پیغام لاتی
اور ہر شام اس کی پیٹھ پر لاتیں جما کر چلی جاتی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا
تھا۔ جسم لاغر ہو گیا تھا۔ راتوں کو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ بچے کی آج
صبح سے زبان بند تھی۔ بس آنکھیں کھول کر دیکھ رہا تھا۔ پھول سے
گال آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔ رنجیت کور اس کے سرہانے بیٹھی
ہوئی غم واندوہ کی جیتی جاگتی مورت معلوم ہوتی تھی۔ کبھی نبض پر
ہاتھ رکھتی تھی۔ کبھی گھبرا کر دل کی دھڑکن محسوس کرتی تھی۔ عورت جب
تک صبر کرتی ہے خوب کرتی ہے اور جب صبر ٹوٹتا ہے تو پھر حد سے
پار ہو جاتا ہے۔ اس نے بلبیر سنگھ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو بس

پڑی بولی "تم ایسے شوہر سے مجھے کیا سکھ؟ ایسے سہاگ سے رنڈاپا کہیں اچھا! اتنا بھی تم سے نہیں ہو سکتا کہ کسی کو دکھا کر لڑکے کے لئے دوا لے آؤ"

"بیمار میں نے کیا ہے اسے؟"

"جو کوئی بیمار کرتا ہے وہی دوا لایا کرتا ہے؟"

"تمہارے پاؤں میں مہندی تو نہیں لگ رہی۔ جا کر لے آئیں"

"مگر تم یہاں کیوں آتے ہو؟"

"یہ میرا اپنا گھر ہے"

"تمہارا اپنا گھر" رنجیت کور نے نفرت کے ساتھ کہا "میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ اس پھول سے بچے کے ساتھ کوئی پیار نہیں آتے ہیں یہاں چھت کی کڑیاں گننے؟ میں پوچھتی ہوں تمہارے ایسے باپ کا، اس بچے کو کیا فائدہ ہے؟"

"ایک تو یہ فائدہ ہے" یہ کہ کر اس نے زور سے ایک چپت بچے کے گال پر رسید کی۔ پورے پنجے کا نشان بن گیا

بچہ تڑپ کر بلبلا اٹھا۔ اس کی گالوں پر موٹے موٹے نیلے نشان ابھر آئے تھے۔ رنجیت کور جلی بھنی تو بیٹھی تھی۔ اس نے اٹھ کر دو تین چپتیں بلبیر سنگھ کو رسید کر دیں۔ بس پھر کیا تھا۔ اسے بہانہ مل گیا۔ بلبیر سنگھ مارتے مارتے تھک گیا۔ رنجیت کور لہو لہان ہو کر بے ہوش ہو گئی۔ وہ دن بھر کی رنجیدہ باہر سے پیٹے مار کر چلا گیا۔

ہوش میں آئی۔ تو بچے کا بخار اسے کھائے جا رہا تھا۔ ان پھوڑے

کی طرح دکھ رہا تھا۔ مگر پھر بھی ساری رات ننھے کو گود میں لئے بیٹھی رہی، بیٹھی رہی اور روتی رہی۔ بچے کو شاید پیاس محسوس ہوئی اس نے زبان ہونٹوں پر پھیرنی شروع کی۔ رنجیت کور گھڑے کی طرف لپکی مگر وہ خالی تھا۔ اس نے گھر کے سارے برتن دیکھ ڈالے مگر کسی میں پانی کی بوند نہ تھی۔ وہ کنوئیں سے پانی لانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی مگر اسے بند پایا۔ زور زور سے کھٹکھٹایا، دستکے دیئے پتھر مارے، مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ ہار کر ننھے کو سینے سے لگا کر بستر پر لیٹ گئی۔

عین اسی وقت کسی نے دروازہ کھولا۔ اس کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ کبھی اس کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا کرتا تھا

"دیوی سنگھ!" اسکی زبان سے نکلا۔

دیوی سنگھ خوش ہو گیا۔ کھل اٹھا۔

رنجیت کور نے درد بھری آواز میں کہا "پہلے کہیں سے ایک گلاس پانی لادو"

دیوی سنگھ لپکا ہوا گیا۔ اور کنوئیں سے پانی کا گھڑا بھر لایا

ایک چمچ پانی اس نے ننھے کے منہ میں ڈالا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

رنجیت کور نے دیوی سنگھ کو پاس بلا کر کہا "تم جیتے اور میں ہاری میں بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کر سکتی ہوں مگر اس بچے کی کوئی

"تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔ بطور ایک عورت کے میں اپنی ضد پر اڑ سکتی
ہوں۔ مگر بطور ایک ماں کے نہیں۔ میرا یہ بچہ میرے ملک کی امانت ہے
میں اسے بھی قربان کر سکتی ہوں۔ مگر اپنے دھرم کے لئے۔ اپنے ملک
کے لئے! لہذا میں ہتھیار ڈالتی ہوں تم جو کچھ کہو گے میں وہی کرونگی
میں تمہاری داسی بن جاؤں گی مگر اس کی جان بچا لو"

دیوی سنگھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کو
اپنے آپ سے اتنی نفرت ہوئی کہ وہ سوچنے لگا۔ کہ وہ اپنے آپ کو
کاٹ کر پھینک دے۔ یہ الفاظ نہ تھے بجلی تھی۔ دیوی سنگھ بغیر کچھ
کہے سنے بھاگ کر ویدجی کو بلا لایا۔ ویدجی نے بچے کو دیکھ کر چوہدری
کے کان میں کہا "بچنا مشکل ہے۔ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا ہے"

دیوی سنگھ نے اپنے ملازم کو اسی وقت تانگے پر شہر بھیجا تاکہ کسی اچھے
سے ڈاکٹر کو بلا لائے۔

ڈاکٹر نے آکر انجکشن لگائے۔ برانڈی پلائی۔ سینے پر تارپین کی
کی مالش کروائی۔ اور پھر کل آنے کے لئے کہہ کر اپنی فیس لے کر چلا گیا
بچے نے تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں اور تھوڑی دیر تک
ادھر دیکھتا رہا پھر اپنی ننھی ننھی باہیں پھیلا کر پکارا "ماں!"
رنجیت کور نے ایک چمچ بھر پانی اس کے منہ میں انڈیل دیا۔ بچہ
چہکنے لگا

دیوی سنگھ کی آنکھیں بچے کی طرف لگی تھیں یہ سب کچھ دیکھ کر

باغ ہوگیا۔ رنجیت کور نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "چوہدری جی!
میں آپ کی بڑی احسانمند ہوں آپ نے مجھے مول لے لیا ہے اب تم
آرام کرو۔ اس کے تندرست ہونے پر میں"
اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر بہنے
لگے۔

دیوی سنگھ سے بھی اب چپ نہ رہا گیا۔ روتے ہوئے بولا "دیوی
کیوں غم مند ہوتی ہو؟" اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔ جب رو رو کر دل کا غبار
ہلکا ہو گیا۔ تو بولا "تم بہت دنوں کی بھوکی ہو۔ اگر کہو تو تھوڑا سا کھانا
لے آؤں؟"

"جب تک ننھا کچھ نہ کھائے گا۔ میں بھی کچھ نہ کھاؤں گی۔ اس نے
صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ جا کر کھانا کھا آؤ۔ بچہ اب بالکل ٹھیک ہے
ہاں کل کسی وقت اس کا حال دیکھنے کے لئے ضرور چلے آنا"

دیوی سنگھ زیادہ زور نہ دے سکا۔ باہر چلا گیا۔ رنجیت کور نے گرتے
پڑتے اٹھ کر اندر سے زنجیر چڑھا لی

آدھی رات کے قریب بچے نے گھبراہٹ سی محسوس کی دو تین
بار "ماں ماں" پکارا۔ اور ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ سانس ٹوٹ گئی
رنجیت کور مردہ بچے کو سینے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے
لگی صحن میں جو دیوار تھی۔ اس کے ساتھ ٹکریں مارنے لگی دسمبر کا مہینہ
تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ مگر اسے کچھ پتہ نہ تھا۔

صبح دیوی سنگھ نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر جواب نہ ملا۔ سوچا ساری رات جاگتے رہنے کے سبب آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آکر اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر اندر سے اب بھی کوئی جواب نہ آیا۔ تب وہ دروازے کو توڑ کر اندر داخل ہؤا۔ جاکر دیکھا تو مارے حیرت کے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ صحن میں دو لاشیں پڑی تھیں سردی سے اکڑی ہوئیں دیوی سنگھ پاگلوں کی مانند رنجیت کور کے پاؤں پر گر پڑا۔ پھر زمین پر پاؤں ٹپکتا ہؤا بولا "دیوی مجھے معاف کرنا، ہار تمہاری نہیں مجھ پاپی کی ہوئی ہے۔ بہن! تم دھنیہ ہو! ایک بار بھگوان کرشن نے بھی بھیشم کی خاطر اپنے عہد کو توڑا تھا۔ مگر وہ بھیشم کی جیت نہ تھی دیوی! مجھے معاف کرو"

اور وہ پاگلوں کی طرح "مجھے معاف کرو مجھے معاف کرو" کہہ کہہ کر زمین پر بار بار اپنا سر ٹپک رہا تھا

نرمل

رمیش نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جب کبھی احباب نے شادی کا ذکر چھیڑا
اس نے یہی کہا۔ کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی سے ہی شادی کرے گا
لیکن ایک دن اس کا یہ خیال محض خیال ثابت ہو کر ہی رہ گیا۔
اس کے والد نے اس سے کہا "اس مہینے تمہاری شادی ہو جانی چاہیے"
"ابھی میں شادی نہیں کروں گا"
"جس وقت میں نے اور تمہاری ماتا نے لالہ کلیان داس سے وعدہ
کیا تھا۔ اس وقت تم بارہ برس کے تھے۔ اور شدھا پانچ برس کی۔
میرا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ جاؤ۔ تم تیار رہو۔ شادی اس مہینے میں
ضرور ہو کر رہے گی۔ اور اسی مہینے میں تمہیں بیرسٹری کے لئے انگلینڈ
بھیج رہا ہوں"
رمیش جب منہ لٹکائے چلنے کو مڑا۔ تو پرتاب رائے جی نے
اس سے دریافت کیا "کیا تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"
رمیش ان سے نگاہ نہ ملا سکا
"کہو؟ جواب دو؟"

حوصلہ کرکے رتیش نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

"کس سے؟"

"آپ اسے نہیں جانتے"

"پھر بھی سنوں تو؟"

"کماری رتنا ایم۔ اے سے"

پرتاب رائے جی کے چہرے پر نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ بولے "اُسی ناچنے والی لڑکی سے"

"جی ہاں۔ رتنا بہت اچھا ڈانس کرتی ہے اس دن اس کے ڈانس سے ہم نے دو ہزار روپے کے ٹکٹ ———

"بس چپ رہو۔ زمیندار کے گھر کی بہو صرف ایم۔ اے ہی ہو سکتی ہے۔ کوئی سٹیج پر ناچنے والی لڑکی نہیں! سمجھے!"

"مگر بابو جی رقص کرنا تو آرٹ ہے"

"اس بڑھاپے میں میں تم سے اپدیش سننا نہیں چاہتا۔ سمجھے رتیش! اور تم اپنے جن دوستوں کو شادی میں مدعو کرنا چاہتے ہو ان کی لسٹ مجھے دے دو۔ کارڈ کل چھپ کر آ جائیں گے"

غم اور غصہ کی آگ میں جلتا ہوا رتیش وہاں سے چل دیا سوچنے
کارڈ چھپ رہے ہیں سب تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور مجھے پتہ
نہیں۔ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اور پتا جی نے اس سے پوچھ
تک ہی نہیں۔ اس کی رائے لینے کی ضرورت بھی انہوں نے محسو

نہیں کی۔ کیا وہ جانور ہے۔ کہ جیسا سلوک چاہیں اس کے ساتھ کریں۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے وہ انگلینڈ جانے والا ہے۔ اس کی مرضی کی کیا کوئی قیمت ہی ہے نہیں۔ نہیں ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ رتنا جب یہ سب سنے گی تو وہ کیا سوچے گی۔ وہ اس کو زبان دے چکا ہے جس رتنا سے بات تک کرنے کو لوگ ترستے اس رتنا کی نسبت پتا جی کا ایسا خیال ہے۔ جو ہزار خوشامدوں کے بعد سٹیج پر آتی ہے جسے دیکھ کر ہزاروں تماشائی واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ پتا جی کی نگاہوں میں اتنی گری ہوئی ہے۔ یہ سب سوچ کر اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی

نہیں نہیں وہ کسی طرح سے بھی سدھا سے شادی نہیں کر سکتا۔ ایسا کرکے وہ اپنے احباب کو، سماج کو اور خاص کر رتنا کو کیا منہ دکھلائے گا۔ رتنا اسے دل و جان سے چاہتی ہے اگر پتا جی قول دے چکے ہیں تو دیتے پھریں۔ رمیش اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ جیسا انہوں نے کیا ہے۔ ویسا بھگتیں۔

مگر پتا کے سامنے رمیش کی ایک نہ چلی۔ اور اسے ایک دل سدھا سے شادی کرنے کے لئے مجبور ہونا ہی پڑا۔ شادی تو اس نے کر لی۔ مگر عہد کیا۔ کہ وہ اپنے اوپر اس کا سایہ تک نہ پڑنے دے گا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھنا تو دور کی بات ٹھیری۔ پتا جی

بہو گھر لائیں اور اپنے کئے کا پھل بھوگیں۔

۲

"ولائیت سے رمیش کی کوئی چھٹی آئی ہے کیا؟" زمیندار پرتاب رائے نے دریافت کیا۔

پرتاب رائے کھانا کھانے بیٹھے ہوئے تھے۔ تھال کے اُس پاس نقرئی کٹوریوں میں انواع اقسام کی سبزیاں رکھی تھیں۔ سُدھا سامنے بیٹھ کر پنکھا ہلا رہی تھی۔ تاکہ مکھیاں دور رہیں۔ اس نے پرتاب رائے جی کا سوال سنا۔ اس کے اندر اس وقت ہلچل مچی ہوئی تھی شادی اس کی ہوئی تو تھی۔ مگر وہ شوہر کو پہچانتی تک نہ تھی۔ شادی سے تین دن بعد وہ ولائیت چلا گیا تھا۔ ان تین دنوں میں ایک بار بھی وہ مکان کے اندر نہیں آیا۔ کھانا بھی باہر ہی منگواتا رہا۔ آج دو برس ہوگئے ہیں۔ اس نے کبھی بات تک پوچھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ کیا مجال جو کہ دو حرفوں کی بھی کوئی چھٹی تک آئی ہو۔ ہر مہینے وہ پرتاب رائے جی سے روپئے ضرور منگوا لیتا ہے۔

اور سُدھا وہ رمیش کو چھٹی لکھتی بھی کیوں؟ پرتاب رائے جی نے اسے خوش رکھنے کے لئے گھر بار تک اپنا وسیع کاروبار بھی اسے سونپ دیا ہے۔ اب تو اگر ان کو خود بھی روپیوں کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اسی سے منگاتے ہیں۔ اور خرچ کا حساب دیتے ہیں

سدھا ہنس کر کہتی۔ "پتا جی یہ آپ کیا کر رہے ہیں"

"کچھ نہیں بیٹی تو اس گھر کی مالکن ہے نا! مالکن سے ہی روپیہ پیسہ مانگا جاتا ہے۔ اور حساب بھی اسے ہی دیا جاتا ہے"

اس پر، اپنے امڈے ہوئے آنسوؤں کو روک کر وہ ان کی طرف دیکھتی ان کے محبت آمیز سلوک کی طرف دیکھتی اور انہیں ہر طرح سے سکھ پہنچانے کی سعی کرتی۔

پرتاب رائے جی کی بات کو ٹالتی ہوئی سدھا بولی: بابوجی! اس مچھلی کو چکھ کر دیکھئے۔ میں نے اس کے بنانے کا طریقہ "باورچی" نامی کتاب میں سے پڑھا ہے"

"تبھی تو اتنی لذیذ بنی ہے تم نے ہی تیار کی ہے نا؟"

سدھا ہنستے ہوئے بولی: "آپ نے اسے چھوا تک نہیں لذیذ کیسے کہہ دیا؟"

پرتاب رائے شرمندہ سے ہو کر بولے "ارے تو! تم رانی بیٹی اتنی چیزیں بنا کر سامنے رکھ دیتی ہو کہ کسی ایک دن مجھے ہیضہ نہ ہو جائے تو کہنا"

سدھا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی "بابوجی آپ کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں آج میں آپ کی ایک نہ سنوں گی آج میں ضرور ڈاکٹر کو بلوا کر ہی رہوں گی"

"دیکھو پگلی کی باتیں! اچھا بھئی بلوا لینا"

سدھا کو ڈاکٹر بلانے کے لئے پرتاب رائے جی اسے بحث نہ کرنی

پڑی۔ اسی دن شام کو زمیندار کے ہاں بہت سے ڈاکٹر بھی آئے اور اسی رات کو ان کی حرکت قلب بھی بند ہو گئی۔ جب وصیت نامہ پڑھا گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ اپنی تمام جائیداد سدھا کے نام کر گئے ہیں

۳

ایک دن سدھا ہاتھ میں جھاڑو لئے کمروں کی صفائی کر رہی تھی۔ منیم نارائن داس پریشان سا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "بیٹی یہ تم کیا کر رہی ہو۔ جس کے حکم کے منتظر پچاسوں آدمی ہر وقت کھڑے رہتے ہوں وہ خود جھاڑو دے۔ ان پورنا کے ہاتھ میں بھنڈار گھر کی چابیاں ہی زیب دیتی ہیں۔ جھاڑو نہیں"

سدھا نے کہا "بابا! بیٹھی بیٹھی تھک گئی ہوں۔ دن رات "رانی جی" اور "بہو جی" سنتے سنتے تنگ سی آ گئی ہوں۔ آج ذرا آدمی بننے کو جی چاہتا ہے"

اس خاندان کی خدمت کرتے ہوئے نارائن داس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ ایک ملازم کی طرح نہیں بلکہ کنبے کے ایک فرد کی مانند ہی اس گھر میں رہتا تھا۔ کمروں کی صفائی کرتے دیکھ کر اسے یہ سمجھتے دیر نہ لگی۔ کہ سدھا کے ایسا کرنے میں کیا راز پنہاں ہے

"بابا! انہوں نے کیا کیا کہنے کو لکھا ہے اور کب آ رہے ہیں یہاں؟ میں نے منا رجاتی بار ان کے آنے کی نسبت سنا تھا۔ مگر اس وقت جلدی میں تھی۔ لہذا ٹھیک طرح سے سن نہیں سکی"

منیم نرائن داس کو ہچکچاتے دیکھ کر سدھا نے کہا "آپ ان کی چیٹھی لاکر ذرا مجھے سنایئے تو سہی"

خواہش نہ ہونے پر بھی منیم نرائن داس چیٹھی لے آیا۔ اور اس کا کچھ حصہ اس طرح سے سنایا

"میں تین تاریخ کو گھر پہنچ رہا ہوں۔ ملاقہ میری کے ساتھ والے کمرے میں میرے لئے صاف کروا دیجئے گا"

سدھا بولی "آپ چھپاتے کیوں ہیں؟ میرے لئے انہوں نے لکھا ہے۔ کہ وہ میرا سایہ تک دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ سب میں سمجھ گئی ہوں۔ آپ میری طرف سے مطمئن رہیئے۔ اس گھر کی بہو اپنے خاندان کی عزت کس میں ہے۔ یہ اچھی طرح سے سمجھتی ہے"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو سدھا!" نارائن داس نے کہا "اس گھر کی بہو راج رانی ہے بھکارن نہیں"

"ہاں اور کیا کیا انہیں چاہیئے؟ بابوجی سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال گئے ہیں۔ ان کی عزت کے لئے مجھے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے آپ مجھے آشیرباد دیں۔ کہ مجھ سے ایسا ہی بن پڑے جس سے کہ خاندان کی عزت برقرار رہے"

"سیٹھ جی نے قابل ور تلاش کیا تھا بیٹی!"

"شاید ایسا ہی ہو۔ اور کیا کرنا ہے ماما؟"

"کھانے پینے کے بارے میں لکھا ہے کہ انگریزی طرز کا ہو"

"اچھی بات ہے۔ پرسوں ہی تو وہ آرہے ہیں ان کو لانے کے لئے
آپ سٹیشن پر تو جائیں گے نا؟"
سر کھجاتے ہوئے نارائن داس بولے" کار بھیج دوں گا میرے
جانے کی کیا ضرورت ہے۔ رمیش کے بہت سے دوست اس
کے استقبال کے لئے سٹیشن پر جائیں گے"
سدھا اپنے کام میں لگ گئی۔
دوسرے دن نارائن داس نے جب کمروں کی سجاوٹ دیکھی۔
تو ان کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔
لائبریری کے ساتھ والے کمرے ہر طرح سے لیس ہو چکے تھے
مغربی طرز کا فرنیچر اور تصویریں، ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی رونق
بڑھا رہی تھیں
"یہ سب تم نے کب اور کیسے کیا بیٹی؟"
"کیوں ایسی کونسی بات ہو گئی!"
"مگر رمیش کے کھانے کے لئے کیا ہو گا۔ وہ ہندوستانی کھانا نہیں
کھائے گا؟"
"سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے ماما۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہاں دو تین
نوکر ان کے لئے الگ کر دیں"
"مگر اس گھر کے باورچی خانے میں مرغی اور انڈے کیسے جا سکتے
ہیں؟"

"اس کے لئے گودام کے ساتھ والا کمرہ خالی کروا دیجئے"

"اور بنائے گا کون؟"

"میں سب کچھ کر لوں گی۔ اور سنئیے بابو جی کی وصیت کا ذکر ان سے بھول کر بھی نہ کیجئے گا"

۴

کھانے کی میز پر بیٹھ کر رتنا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی بولی "آپ کے ہاں یورپین طرز کا اتنا بڑھیا کھانا تیار ہو سکتا ہے ایسا مجھے معلوم نہ تھا۔

رمیش کے ہاں اس دن پارٹی تھی

مینا بولی "کیوں آپ نے ایسا کیوں سوچا یہ ولایت سے لوٹے ہیں۔ امیر ہیں تعلیم یافتہ ہیں ان کے اگر چکن اور پڈنگ بن گیا تو اس میں حیرانگی کی کونسی بات ہے"

"یہ لوگ کٹر پنتھی ہیں۔ زمیندار کے گھر کھانے کی میز پر چکن اور پڈنگ ایک نئی بات ہے۔ اس لئے میں حیران ہوں۔ کہ یہ سب آج یہاں کیسے ہو گیا" رتنا نے کہا۔

"یہ سب کیسے ہو گیا" رمیش سوچنے لگا "واقعی ہی اس گھر میں یہ بالکل نئی بات ہے ہمارے تو سب کٹر پنتھی ہیں مگر یہ تبدیلی کیسے ہو گئی۔ مجھے اس سے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں میں تو بس منیم نارائن داس کو آرڈر دے دیتا ہوں"

"انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد میں ہر روز ایسا ہی کھانا کھاتا ہوں۔ یہ سب کیسے تیار ہوتا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا" رمیش نے کہا

نند سنگھ ہنس کر بولے "تو اپنے گھر کی بات تم خود ہی نہیں جانتے"

مس رتنا نے جواب دیا "بیچارے کیا جانیں کئی سال کے بعد واپس آئے ہیں۔ اور پھر اندر کبھی جاتے نہیں"

دیویندر بولے "بھائی کھانا تو اتنا اچھا بنا ہے کہ کیا کہیں۔ آج کل نوکروں کی بڑی دقت ہے اپنے باورچی کو بلاؤ۔ ایک باورچی کی تلاش کرنے کے لئے کہیں"

بیرے سے رمیش نے کہا "باورچی کو بلا لاؤ"

بیرے کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی بولا "باورچی کون صاحب؟"

"عجیب بے وقوف ہے ارے جو کھانا بناتا ہے اسے بلا لاؤ"

بولے "صاحب اس پر بھی کھڑا ہی رہا۔ تو رمیش جھلایا "اب بھی کھڑا ہے بلاتا کیوں نہیں؟"

"کسے صاحب؟"

رجموہن بولا "تم ٹھیرو۔ میں پوچھتا ہوں یہ کھانا کس نے بنایا ہے"

"بہو جی نے"

رمیش حیران سا ہو کر رہ گیا۔ وہ کھانا بنا ہی ایسا تھا لذیذ۔

"آج ہی بنایا ہے یا ہر روز؟" کچھ ادھر سے کہا

"صاحب کھانا تو باورچی پکاتا ہے مگر صاحب کے لئے چا

لنچ اور ڈنر باورچی خانے میں بیٹھ کر بہو جی خود تیار کرتی ہیں۔"

"اچھا تم جاؤ۔" برجموہن نے بولٹے سے کہا۔ پھر رمیش سے کہا۔"بہو جی تمہاری ہی تو بیوی ہے۔ شادی کی کہانی تو میں نے سنی تھی۔ تو ان سے ہی کیا تمہاری شادی ہوئی تھی ؟"

"ہاں"

"ذرا انہیں بلوا سکو گے ؟"

"یہاں ؟" رمیش ایسے چونکا جیسے اسے اچانک سانپ سامنے دکھائی دیا ہو۔

کیدار نے آہستہ سے رتنا سے کہا۔"کیا تم نے اسے دیکھا ہے ؟"

رتنا برا سا منہ بنا کر بولی۔"دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کہ دیکھنے کے قابل اس میں کچھ بھی نہیں۔"

کھانے سے فارغ ہو کر سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر برجموہن نے رمیش سے دریافت کیا "یہ تصویریں کس نے بنائی ہیں ؟"

رمیش سوچنے لگا۔ یہ تصویریں کس نے بنائی ہیں۔ بازار سے خریدی ہوں گی۔ بہت ہی خوبصورت تصویریں تھیں

ملازم پان لے کر کھڑا تھا بولا۔"یہ سب تصویریں بہو جی نے بنائی ہیں۔"

صبح جب رمیش اٹھا۔ تو دیکھا کہ ٹینس لان میں بھوانی کا مندر

تیار ہو رہا ہے۔ اس نے نارائن داس سے دریافت کیا، "یہ کیا بن رہا ہے؟"

"دیوی بھوانی کا مندر"

"اور وہ پہلا مندر؟"

"وہ پرانا ہو گیا ہے"

"یہ سب آپ کس کے حکم سے کر رہے ہیں؟"

"بھوجی کے حکم سے"

بھوجی۔ پھر بھوجی! رمیش جھلایا۔ اس بھوجی نے چاروں طرف خوب جال پھیلا رکھا ہے،

نارائن داس مسکراتا ہوا چلا گیا

ان ایام میں ٹائیفائڈ کا زور تھا۔ رمیش پر بھی بخار کا حملہ ہوا نرسوں اور ڈاکٹروں سے گھر بھر گیا۔ اپنے دوست ڈاکٹر برجموہن کی جگہ دوسرے ڈاکٹر کو دیکھ کر رمیش نے اس سے دریافت کیا۔

"آپ کو کس نے بلایا؟"

"بھوجی نے"

"بھوجی! بھوجی!! بھوجی!!! ہر وقت اور ہر بات میں بھوجی!"

بڑبڑاتے ہوئے رمیش نے منہ پھیر لیا

شام کے وقت رمیش نے دیکھا۔ کرشن کی زندہ تصویر اس پر جھکی ہوئی ہے۔ اور فروٹ جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھا رہی ہے

"پی لیجیے"

رمیش نے اسے کچھ اس طرح سے دیکھا۔ کہ وہ سہم گئی۔ "تم کون ہو؟"

"نرس!"

"نرس! تم بہت خوبصورت ہو!"

نرس کے خوبصورت چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ سہمی ہوئی بولی: "پی لیجیے"

"تم کہاں رہتی ہو؟"

"ماڈل ٹاؤن!"

"تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے؟"

"بہو جی نے"

"بہو جی! بہو جی!!" رمیش بڑبڑانے لگا

رمیش نے غسل صحت کیا۔ نرس رخصت ہو رہی تھی۔

"مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہو۔ تو معاف کیجیے گا۔ میں جا رہی ہوں۔" نرس نے کہا۔

رمیش اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے نرس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "نہیں میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ زندگی میں میں نے صرف تمہیں چاہا ہے اب تم بھی جا رہی ہو ———— اگر تم نے جانا ہی تھا۔ تو اس طرح سے خدمت کر کے مجھے زندگی ہی کیوں بخشی!

ایسی صورت اور اتنی خوبیاں لے کر تم میرے سامنے ہی کیوں آئیں جانا ہی تھا۔ تو میری محبت کو بیدار کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ بولو جواب دو؟"

نرس چُپ رہی

"نہیں نہیں۔ مَیں تم کو نہیں جانے دوں گا"

"مگر اس گھر میں مَیں رہ کیسے سکوں گی؟"

"میری بیوی کی حیثیت سے! کیوں راضی ہو؟"

نرس چپ تھی۔

"آج سے تیسرے دن ہماری شادی ہو گی"

رمیش خوش تھا۔ اور جب وہ سول میرج کر کے گھر لوٹا تو گھر میں چہل پہل نہ دیکھ کر اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے نارائن داس سے دریافت کیا "میرے بار بار کہنے پر گھر میں شادی کے جشن کی تیاری کیوں نہیں کی گئی؟"

"بہو جی نے منع کر دیا تھا"

"بہو جی! بہو جی منع کرنے والی ہوتی کون ہے؟"

بوڑھا ہنسا۔ "آپ کے سامنے ہی تو کھڑی ہیں۔ ان سے ہی دریافت کر لیجئے؟"

"بہو جی سامنے کھڑی ہیں۔ کیا بک رہے ہیں آپ؟"

"یہی تو ہیں بہو جی!" اتنے میں برجموہن آ گیا بولا "واہ بھابھی

تم یہاں دلہن بنی کھڑی ہو۔ اور ادھر مہمان آیا ہی چاہتے ہیں کھانا کون تیار کرے گا؟"

اتنے میں ملازم نے آکر دریافت کیا "بہو جی! باورچی پوچھتا ہے کہ پاؤ باورچی خانے میں ہی پکایا جائے گا۔ یا باہر میدان میں؟"

رمیش نے دلہن کی طرف دیکھا "تم! تم!! تم ہی بہو جی اور نرس ..... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

برجموہن نے جواب دیا "نرس اغوا کر لی گئی ہے۔ کل رات کو اب جو ہیں اس گھر میں بہو جی ہیں!"

مسکراتی ہوئی مسدھا وہاں سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی "کہیں مجھے بھی پھر اغوا کر نہ لے جائے کوئی!"

برجموہن کے قہقہے سے ڈرائنگ روم گونج اٹھا

چچا جی شیلانگ کو

کلکتہ میں یو۔پی کے جو لوگ ملازمت کے سلسلہ میں رہتے ہیں
ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنا ایک کلب بنا رکھا ہے اس کلب
کا نام ہے "سنڈے کلب" کیونکہ اس کلب کے ممبر اتوار کو ہی
کلب میں اکٹھے ہوا کرتے ہیں اس لئے اس کا نام "سنڈے کلب"
رکھا گیا ہے۔

کلب کے کئی ممبر ایسے بھی ہیں۔ جو کہ اتوار تک انتظار نہیں
کر سکتے۔ لہذا ہر روز شام کو تفریح کے لئے کلب پہنچ جایا کرتے ہیں
ایسے ممبروں میں سے ایک مسٹر ورما بھی ہیں۔ وہ اکونٹنٹ جنرل
بنگال کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ کلکتہ میں وہ بچپن میں آئے
تھے۔ کلب کے تمام ممبروں سے عمر کے لحاظ سے وہ بڑے ہیں
لہذا ممبروں نے کلب کا صدر بھی انہیں ہی بنا رکھا ہے

مسٹر ورما میں زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے چہرے
پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے ان کی ہر بات اپنے اند

قہقہوں کا طوفان لئے ہوئے ہوتی ہے

مسٹر ورما کو کلب کے ممبر از راہ مذاق چچاجی کہا کرتے ہیں ہر روز شام کو کلب میں بڑی بیتابی سے چچاجی کا انتظار کیا جاتا ہے کیونکہ جب تک وہ تشریف نہ لائیں۔ کلب کی رونق پھیکی سی رہتی ہے

جنگ سے پہلے محکمہ ریلوے مسافراں کو بہت قسم کی مراعات دیا کرتا تھا۔ ایسٹر، دسہرہ، بڑے دنوں کی چھٹیوں میں واپسی ٹکٹ جاری کئے جاتے تھے۔ جس سے کہ لوگ زیادہ سفر کریں۔ دسہرہ کی چھٹیاں ہونے کو تھیں۔ ریلوے کے محکمہ کی طرف سے اخباروں میں اشتہار دیا گیا تھا۔ کہ شیلانگ کا سفر یکطرفہ کرایہ سے کیا جاسکتا ہے۔

اس دن چچاجی کے کلب پہنچنے کے ساتھ ہی نوجوانوں نے شیلانگ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ وہ بار بار چچاجی کو شیلانگ کی سیر کے لئے مجبور کرنے لگے۔

چچاجی بولے "تم سب تو بےوقوف ہو۔ شیلانگ جیسے سرد مقام پر جا کر بھلا میں کیا کروں گا۔ وہ تو صاحب لوگوں کے ہوا کھانے کے لئے ہے۔ حال ہی میں میری خالہ زاد بہن کے دیور دینا ناتھ شیلانگ گئے تھے وہ کہتے تھے۔ بڑی خراب جگہ ہے وہاں بارہ مہینے ہی برسات ہوتی رہتی ہے۔ سردی بہت زیادہ پڑتی ہے پانی اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ کہ ہاتھ سے چھونے کی ہمت

نہیں ہوتی"

پارس داس بولے "چچا جی آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ مگر آدمی اگر پیسے خرچ کرے تو اسے شیلانگ کیا۔ مونٹ ایورسٹ پر بھی کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ بغیر پیسے کے تم کالی گھاٹ تک بھی نہیں جا سکتے"

پارس داس کی بات سن کر چچا جی کچھ جھلا اٹھے بولے "جا کیوں نہیں سکتے۔ اگر آدمی ارادہ کرے تو کیا نہیں کر سکتا۔ میں جب چھوٹا سا تھا۔ تو بھگوان کی دیا سے کالی گھاٹ تک مفت ہی آیا جایا کرتا تھا"

گردھاری لعل بولے "چچا جی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ پر بھگوان کی کتنی دیا ہے۔ بھلا دسہرے کی چھٹیوں میں بغیر ایک پیسے کے شیلانگ کی سیر کرکے دکھائیے تو!"

شنکرداس بولے "میں ماموں جان سے کہہ کر تمہیں آنے جانے کا پاس دلوا دوں گا۔ باقی بندوبست آپ خود کر لیجئے گا"

چچا جی چپ تھے۔

سنڈے کلب میں دیارام نامی ایک نوجوان آیا کرتا تھا اس کے والد کی ہیریسن روڈ پر فرنیچر کی بڑی بھاری دکان تھی۔ وہ شاہ خرچ تھا۔ جہاں کلب کے دوسرے ممبر ایک روپیہ خرچ کرتے تھے وہ دس کرتا تھا۔ اس نے کہا۔ اگر چچا جی بغیر پیسے کے شیلانگ کی سیر

تو تین سو روپیہ ان کی نذر کروں گا"

اب تو چچا جی مارے خوشی کے اچھل پڑے اور جو کچھ انہوں نے کہا۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ میں شیلانگ جاؤں گا۔ پاس اور روپوں کا انتظام کیا جائے"

کلب کے ممبروں میں دو شاعر بھی تھے۔ اختر بنارسی اور مہر فیض آبادی انہوں نے اسی وقت ایک نظم لکھی "شیلانگ چلو" اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔ باقی ممبر بھی ان کے ساتھ مل گئے وہ شور مچا کہ خدا کی پناہ۔ محلے والے سوچ رہے تھے۔ کہ آج ان کلب والوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جو ذرا منچلے تھے۔ انہوں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ دیکھا کہ چچا جی درمیان میں کھڑے ہیں۔ اور باقی ممبران ان کے آس پاس گھیرا ڈال کر "بھنگڑہ" ناچ" ناچ رہے ہیں۔ راہگیر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے لگے۔

کلکتہ میں دسہرہ کے ایام میں "درگا پوجا" کے تہوار کے سبب بارہ چھٹیاں ہوا کرتی ہیں۔ کل شام کو چچا جی شیلانگ جانے والے تھے۔ دیا رام نے ایک سو روپے کے نوٹ چچا جی کے ہاتھ میں دیدیئے۔ اور کہا کہ واپس آ کر یہ نوٹ مجھے دکھانے ہوں گے ان روپوں کو آپ جیب روپیہ کے بغیر جان بھی نظر نہ آتی ہو۔ خرچ کر سکیں گے"

کلب کے دوسرے ممبروں نے بھی چچا جی کو ہولڈال۔ اٹیچی کیس

اور چیسٹر وغیرہ سفر میں استعمال کرنے کے لئے دیئے۔

گاڑی میں سوار ہونے کے لئے چچا جی ٹھیک وقت پر سیالدہ سٹیشن پر پہنچ گئے۔ سنڈے کلب کے بہت سے ممبر انہیں رخصت کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ چچا جی کے لئے شنکر داس انٹر کلاس کا پاس لے آیا تھا۔ چچا جی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اور گپ شپ اڑنے لگی۔ شام باندرہ سے وہ جس ٹیکسی پر بیٹھ کر آئے تھے۔ اس کا ڈرائیور سٹیشن سے باہر ان کا انتظار کر رہا تھا ٹیکسی پر سے اترتے وقت انہوں نے کہا تھا۔ کہ ٹکٹ لے کر ابھی تمہیں کرایہ دے جاتا ہوں۔ چچا جی نے ٹیکسی کا نمبر ۱۵۹۴ اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا تھا

سٹیشن پر درگا پوجا کے سبب بہت زیادہ بھیڑ تھی ڈرائیور انتظار کرکے تنگ آگیا۔ آخرکار وہ سٹیشن کے اندر داخل ہو کر مختلف گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگا آسام کی طرف جانے والی میل کبھی کی جا چکی تھی۔ بڑوں کی جان کو روتا ہوا ڈرائیور سٹیشن سے باہر آگیا۔ وہ بے چارہ ابھی ابھی پنجاب سے آیا تھا۔ وہ یہ نہ جانتا تھا۔ کہ کلکتہ میں ڈیڑھ روپیہ میں ایمان بیچنے والے چچا جی بھی رہتے ہیں

پوڑادہ سے سٹیشن پر پہنچنے کے ساتھ ہی گاڑی مسافروں سے بھر گئی۔ ٹرنکوں بستروں اور گٹھڑیوں کا انبار سا لگ گیا۔

جس کے سبب اسباب سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا۔ اور بیٹھنا بھی۔ جو لوگ پہلے ہی سے جم کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تو آرام سے بیٹھے رہے جو بعد میں آئے تھے۔ وہ سیٹوں کے درمیان کھڑے ہو کر۔ کھڑکی سے باہر سے نظر آنے والے بھی قدرت کے نظارے دیکھنے لگے۔ ان کے علاوہ ایسے بھی تھے۔ جن کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مسافر ہی مسافر تھے

اس ڈبے میں دو مارواڑی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سامان بہت زیادہ تھا۔ اپنے سامان سے چپٹ کر وہ مزے سے بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں چاچاجی بھی بیڑی کے کش لگا رہے تھے۔ ان کو اس وقت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ صبح دس بجے انہوں نے ماش کی دال اور چاول کھائے تھے۔ اس کے بعد اس وقت تک ان کو کچھ کھانے کو نہ ملا تھا۔ اس وقت کھانا کھانے کا وقت تھا۔ اور آج چونکہ سفر کی تیاری کی وجہ سے انہیں دوڑ دھوپ بھی زیادہ کرنی پڑی تھی۔ لہٰذا ان کو بھوک ذرا محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ آئے تھے۔ کہ میں بغیر پیسے، شیلانگ کی سیر کر کے واپس آؤں گا۔

چاچاجی حیران سے ہو کر سوچنے لگے۔ ہاں لیجئے میں قلی کا کام خود کر لوں گا۔ کیونکہ میرے پاس سامان بہت زیادہ نہیں ہے۔ اور اسے اٹھا کر میں دو چار میل تک پیدل بھی چل سکتا ہوں۔ مگر بغیر کچھ کھائے پیئے کام کیسے چلے گا۔ میرے پاس جو سو روپیہ کے نوٹ

ہیں دینا مجھے واپس جاکر ججوں کے تھیلے دکھانے ہیں۔ میں دس، پانچ روپے اپنی جیب سے خرچ کر لیتا۔ مگر میری تلاشی لے کر مجھے گاڑی میں سوار کیا گیا ہے

تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد چچا جی نے بھوک دور کرنے کا علاج سوچ لیا۔ چچا جی ہر روز اپنے دفتر میں کلرکوں کی غلطیوں کے متعلق پہلے سوچتے ہیں۔ پھر ان کو درست کروا دیتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی عقل آڑے آئی۔

چچا جی کے ساتھ ہی جو مارواڑی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں نیند آ رہی تھی۔ وہ لیٹ گئے۔ ان کے پاس پڑے ہوئے ٹفن کیریر کی طرف چچا جی کی نگاہ تھی۔ موقعہ پاکر انہوں نے ٹفن کیریر کو کھول کر اس میں سے تھوڑا سا حلوا جلیبیاں، پوڑیاں اور بھاجی نکال لی۔ ٹفن کیریر کو بدستور بند کر کے رکھ دیا۔ اور گاڑی سے باہر منہ نکال کر مزے سے سب کچھ ڈکار گئے۔ مارواڑی گہری نیند میں تھے رات اور بھیڑ کی وجہ سے دوسرے مسافر انہیں نہ دیکھ سکے

مارواڑیوں نے صبح جب وقت ٹفن کیریر کھولا ہو گا۔ تو چچا جی کو پیٹ بھر کر گالیاں دی ہوں گی

صبح گاڑی اسٹیمر گھاٹ پہنچ گئی۔ وہاں اسٹیمر پر سوار ہونا تھا۔ چچا جی حوائج ضروری سے فراغت حاصل کر کے گھاٹ پر ٹہلنے لگے۔ گھاٹ کے نزدیک ہی ایک ریسٹورنٹ تھا۔ وہاں لوگ ناشتہ

سب سے پہلے چچا جی کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اور انہوں نے اس کے لئے طریقہ بھی سوچ لیا۔ ایک دن جب وہ کلکتہ میں دوریکا نند سٹریٹ میں سے گذر رہے تھے۔ ان کو لائیڈ بنک کی ایک چیک بک ملی تھی۔ انہوں نے اسے اٹھا لیا تھا۔ آج اسی سے کام لینے کا انہوں نے فیصلہ کیا۔ سوٹ کیس سے چیک بک نکال کر چچا جی ایک کرسی پر ڈٹ گئے۔ اور بہرہ کو کھانا لانے کے لئے کہا۔ سامنے طشتری آجانے پر انہوں نے اتنے بڑے بڑے لقمے منہ میں ڈالے۔ کہ دیکھنے والے حیران سے ہو گئے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ تو بہرہ ساڑھے پانچ روپے کا بل لایا۔ چچا جی نے چھ روپے کا ایک چیک کاٹ کر اس کے حوالے کیا۔ ہوٹل کے منیجر نے لائیڈ بنک کا چیک دیکھ کر اسے چپکے سے کیش بک میں رکھ لیا۔

امین گاؤں کے اُس پار پانڈو گھاٹ ہے وہاں سے دو میل کے فاصلہ پر شہری کا مکھیا دیوی کا مندر ہے۔ چچا جی نے دور سے ہی دیوی کو ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر وہ گوہاٹی دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ شہر پانڈو گھاٹ کے پاس ہی دریائے برہم پتر کے کنارے پر آباد ہے آسام کا مشہور شہر ہے۔ تجارتی منڈی ہے گوہاٹی سے شیلانگ تک پہاڑی راستہ ہے

شیلانگ پہنچ کر چچا جی نے فیصلہ کیا کہ یہاں میں چار پانچ دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا۔ کیونکہ پھر بنک کھل جائے گا۔ جہاں لوگوں

سے میرے چیک بھنوانے شروع کیئے۔ بھنڈا پھوٹا

شیلانگ کے "ہل ٹاپ" ہوٹل میں جا کر چچاجی نے مینجر کو جو چٹ بھیجی اس پہ اپنا نام رائے بہادر لالہ پدم شنکر رئیس اعظم راجہ پور ضلع پرتاب گڈھ (یو۔پی) لکھا۔ جس وقت یہ چٹ مینجر کو ملی تو وہ لپکتا ہوا آپ کے پاس پہنچا۔ اور آپ کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اور آپ کو آپ کے دورانِ قیام میں ہر طرح سے آرام پہنچایا۔ شیلانگ کا ہر قابل دید مقام دکھایا۔ وہ آپ کے پاس......... یہ دریافت کرنے کے لئے آتا تھا کہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟ چچاجی نے..... ایک دن ایک سو روپے کا چیک اس سے بھی بھنوایا

ہل ٹاپ ہوٹل کے مینجر نے راجہ پور کے رائے بہادر لالہ پدم شنکر کا تعارف شیلانگ کے سرکردہ اصحاب سے بھی کرا دیا رائے بہادر صاحب نے ایک دن چائے کے باغات کا معائنہ بھی کیا۔ ایلیفنٹ ہال بھی دیکھا

اب چچاجی نہیں نہیں رائے بہادر صاحب واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ ایک فوٹوگرافر سے اپنی فوٹو اتروائی۔ سنڈے کلب کے ممبروں کے لئے بہت سی سوغاتیں خریدیں اور اس طرح چھبک بنک کے بہت سے چیک اشوع کرکے وہ ایک دن سیالدہ کے راستہ کلکتہ واپس آگئے۔
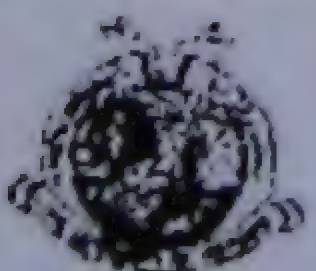
انہوں نے اپنی واپسی کے متعلق کلب کے سیکرٹری کو تار دیدیا
تھا۔ چنانچہ سیالدہ سٹیشن پر کلب کا ہر ممبر آپ کے استقبال
کے لئے موجود تھا۔ جب چچاجی کے رفقا نے آپ کے ساتھ اتنا
سامان دیکھا۔ تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی
جب سٹیشن سے باہر نکلے۔ تو مسٹر دیارام نے اپنے نوٹ
طلب کئے۔ چچاجی نے جیب سے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں
دیدیئے۔ نمبر ملا کر دیکھے تو دیارام کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا
کھلا رہ گیا۔
چچاجی شیلانگ سے جو تحائف لائے تھے۔ وہ انہوں نے
اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیئے۔ ان کے سفر کا حال سن کر ان
کے رفقا مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ ہو گئے۔ مسٹر دیارام نے شیلانگ
کے تمام دوکانداروں کو چچاجی کی خریدی ہوئی اشیاء کی قیمت بذریعہ
منی آرڈر بھجوادی۔ اور ساتھ ہل ٹاپ ہوٹل کے مینجر کو لکھ دیا کہ اگر
کسی شخص کی کوئی رقم رائے بہادر کی طرف باقی نکلتی ہو۔ تو وہ تحریر
کریں۔ فوراً بھجوادی جائے گی

ختم شد

سورج پرکاش پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر لوہاری دروازہ لاہور سے شائع کیا